ماہنامہ

فکرِ نو

علی گڑھ

مئی ۲۰۱۹ء

مدیر

ریاض الرحمٰن شروانی

ماہنامہ
فکرِ نو
علی گڑھ

مدیر
ریاض الرحمٰن شروانی
معاون مدیر
ڈاکٹر مفتی زاہد علی خاں

سال دوم ☆ مئی ۲۰۱۹ء ☆ شمارہ نمبر (۱۰)

☆

قیمت فی شمارہ: ۱۵ روپے
قیمت سالانہ: ۱۵۰ روپے

فہرست

ادارے کا مضمون نگاروں کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں

پبلشر مسز غزالہ پروین نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائز علی گڑھ سے چھپوا کر حبیب منزل، میرس روڈ علی گڑھ سے شائع کیا

ادا ریہ

پھر کس سے انصاف چاہیں؟

آج سے ستر برس پہلے رات کے اندھیرے میں اجودھیا میں مورتیاں رکھ دی گئیں اور کہا گیا کہ یہ مندر تھا جسے بابر کے عہد حکومت میں توڑ کر مسجد بنا دیا گیا تھا۔ اب وہاں پھر مورتیاں نمودار ہوگئی ہیں۔ مسلمان انصاف کے لئے جگہ جگہ بھاگے مرکز و ریاست دونوں جگہ کانگریس کی حکومت تھی مسلمان انصاف کے لیے مختلف درباروں میں حاضر ہوئے وزیر اعلیٰ اتر پردیش پنڈت پنت نے سیاست دانوں کے طریقے کے مطابق تفتیش کا حکم دے دیا پھر وہ مرکز میں پہنچے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے کہا کہ میں خود اجودھیا جا کر معاملے کو سلجھاؤں گا پنڈت پنت کو لکھا کہ میں وہاں آنا چاہتا ہوں پنڈت جی نے جواب دے دیا کہ میں تفتیش کر رہا ہوں آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہرو جی مطمئن ہو کر بیٹھ گئے اب یہ لوگ وزیر تعلیم مولانا آزاد کی خدمت میں حاضر ہوئے انہوں نے مشورہ دیا کہ قانونی کارروائی کرنی چاہیے۔ اس قانونی کارروائی کو آج ستر برس ہوگئے معاملہ نچلی عدالت سے شروع ہو کر ہائی کورٹ ہوتا ہوا سپریم کورٹ پہنچا۔ اور اب تک فیصلہ طلب ہے شری راجیو گاندھی کی وزارت عظمیٰ کے دوران عمارت کے دروازے جو ۱۹۴۹ء میں بند کر دیے گئے تھے، ۱۹۸۶ء میں کھول دیے گئے اور پوجا ہونے لگی۔ راجیو گاندھی نے پہلے شاہ بانو اور محمد احمد کی طلاق کے معاملہ میں ایسا فیصلہ کیا تھا جس سے مسلمان خوش ہو گئے اب ہندوؤں کو خوش کرنے کی باری تھی اس لیے اس کے دروازے کھول دیے گئے اور پوجا ہونے لگی، ۱۹۹۲ء میں جب نرسمہا راؤ وزیر اعظم تھے اور شری کلیان سنگھ (بھاجپا) اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ تھے۔ آر ایس ایس کے سورماؤں نے عمارت کو گرا دیا۔ ان کے خلاف مقدمہ چلا لیکن آگے پیچھے سب بری ہوگئے۔ الہ آباد ہائی کورٹ نے ایسا فیصلہ سنایا جو کسی نے مانگا ہی نہیں تھا بابری مسجد کے انہدام نے مسلمانوں کو شدید تکلیف پہنچائی اور اب ان کی انصاف کی توقع صرف سپریم کورٹ سے وابستہ رہ گئی ہے۔ اب معاملہ خود سپریم کورٹ میں ہے معاملے کو سپریم کورٹ میں گئے ہوئے بھی آٹھ برس ہوگئے اور ابھی تک نتیجہ سامنے نہیں آیا اور اتنی طویل مدت کے بعد یہ مشورہ صادر ہوا کہ فریقین آپس میں گفتگو کر کے مصلحت کر لیں کیونکہ اگر ہم فیصلہ دیں گے تو زبردست مار کاٹ ہونے کا اندیشہ ہے۔ سپریم کورٹ کے اس مشورے سے کئی باتیں صاف ہوئیں اور کئی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ مسلمانوں نے شروع ہی

میں کہہ دیا تھا کہ سپریم کورٹ کا جو بھی فیصلہ ہوگا ہمارے لیے قابل قبول ہوگا۔ جبکہ فریق ثانی نے کہا تھا کہ یہ عقیدے کا مسئلہ ہے اس لیے اگر فیصلہ ہمارے خلاف ہوا تو ہم اسے تسلیم نہیں کریں گے۔ اب سپریم کورٹ نے جو کچھ کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ انصاف کی سوئی کس طرف گھوم رہی ہے۔ عدالت کا کام فیصلہ سنانا ہوتا ہے اس پر عمل کرانا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے اس رائے سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ عدالت عظمیٰ حکومت کی اس ذمہ داری کے پورا ہونے سے کتنا مایوس ہے تیسری بات یہ ہے کہ اگر معاملہ باہمی گفتگو ہی سے طے ہوسکتا تو اس کے طے ہونے میں اتنی طویل مدت کیوں لگ جاتی۔ ایک اور بات جو پینل باہمی گفتگو کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہ عدالت نے کیا ہے فریقین نے نہیں۔ اور اس میں کم از کم ایک رکن ایسے ہیں جن کی رائے پہلے سے معلوم ہے۔

ہندوستان میں اب تک عوام بالخصوص اقلیتوں کو سب سے زیادہ اعتماد عدالتوں اور ان میں بھی عدالت عظمیٰ پر تھا لیکن جب عدالتیں اور خاص کر عدالت عظمیٰ اپنے فرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنے لگے تو پھر ہم کس سے انصاف چاہیں؟۔

دو جرم اور دو ردِّ عمل

مغربی ممالک جنہیں بالعموم ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے کی روایت بن گئی ہے کہ کچھ مدت کے بعد مختلف ملکوں میں کوئی ایسی بڑی واردات پیش آجاتی ہے جو حیران کن اور تکلیف دہ ہوتی ہے کسی اسکول یا کالج کسی ریستوران یا عبادت گاہ میں کوئی ایسا واقعہ پیش آجاتا ہے جو بڑی تعداد میں لوگوں کی موت کا باعث ہوتا ہے۔ ابھی حال میں ایک آسٹریلیائی نے نیوزی لینڈ کی ایک مسجد میں گولی چلاکر پچاس مسلمانوں کو شہید اور اتنے ہی کو زخمی کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا سبب ان کا مذہب نہیں تھا بلکہ دوسرے ممالک سے وہاں جا بسنا تھا۔ ہماری رائے میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا بہر حال ایک سو افراد اس کی زد میں آئے اور وہ سب مسلمان تھے وہ اپنا ملک چھوڑ کر اس لیے وہاں آئے تھے کہ ان کے مطابق وطن میں ان کے ساتھ ناروا سلوک ہو رہا تھا پھر وہ جاتے کہاں؟ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے ایسے واقعات متعدد ملکوں میں متعدد بار پیش آچکے ہیں لیکن صدمہ پہنچانے والا ضرور ہے اور اس کی جتنی مذمت بھی کی جائے روا ہے۔

یہ تو تھا اس واقعے کا ایک پہلو ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو غیر معمولی اور حوصلہ افزا ہے۔ نیوزی لینڈ کے عوام ہی نے نہیں وہاں کی حکومت اور بالخصوص خاتون وزیر اعظم نے جس ردِّ عمل کا اظہار کیا اس کی مثال ملنی دشوار ہے وزیر اعظم مہلوکین اور زخمیوں کے گھر خود ان کا لباس پہن کر تعزیت کرنے کے لیے گئیں۔ اور اقتصادی طور پر مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ قاتل کو گرفتار کرلیا گیا اور اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ ایسے معاملے میں گرفتار کرنا اور مقدمہ چلانا تو

عام بات ہے لیکن اتنے شدید ردعمل کا اظہار غیر معمولی بات ہے۔ دوسرے ممالک اور وہاں کے حکمرانوں کو اس مثال سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور اس کی پیروی کرنی چاہیے۔ اس کے برعکس بالعموم ہوتا یہ ہے کہ قصورواروں کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کے بہانے تلاش کیے جاتے ہیں اور اگر سزا دی بھی جاتی ہے تو اس میں بہت وقت لگ جاتا ہے پچھلے اداریے میں ہم خود اپنے ملک میں بابری مسجد کے واقعے میں اس کی مثال پیش کر چکے ہیں۔

ایک دوسرا واقعہ پاکستان میں پیش آیا چند ہندو لڑکیوں کو غنڈے اٹھا لے گئے اور انہیں زبردستی مسلمان بنا کر اس سے شادی رچالی۔ وزیراعظم نے صوبائی حکومت (سندھ) کو ہدایت کی کہ مسئلے کی تفتیش کی جائے یہ تفتیش سیاست دانوں کا معاملے کو ٹالنے کا عام بہانہ ہوتا ہے ایک کھلاڑی (کرکٹر) وزیراعظم سے ہمیں اس سے زیادہ کی توقع تھی انہیں پہلے سخت الفاظ میں واقعے کی مذمت کرنی چاہیے تھی۔ جیسا کہ نیوزی لینڈ کی وزیراعظم نے کیا اور پھر تفتیش کا حکم دینا چاہیے تھا۔

ان امور میں ملک مذہب نسل کا فرق بے معنی ہے انسان انسان ہے اور انسانی جان اور اس کی ہر گونہ حفاظت اور بقا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے جو حکومت چاہے ایشیائی ہو یا افریقی یا یوروپی اور اس کا کسی مذہب سے تعلق ہو اس فرض کی ادائیگی سے قاصر رہتی ہے وہ قابل مذمت ہے اور جو اس فرض کی ادائیگی میں کامیاب ہوتی ہے وہ قابل تعریف ہے۔

انسانی جان اور اس کی عصمت و وقار کی قیمت بہت کم ہوگئی ہے جس سے دنیا میں انتشار پھیلا ہوا ہے اس لیے اہل قلم کا فرض ہے کہ وہ بلا تفریق این وآں اس طرح کے واقعات کی مذمت کریں اور اگر کوئی خوشگوار مثال سامنے آئے تو اس کی تعریف کریں۔

ریاض الرحمٰن شروانی

اسلام اور مسلمان ہندستان میں*

اے. ایم. خسرو
(وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی ۱۹۷۴-۱۹۷۹ء)

اسلامی تاریخ میں یا تو مسلمان حاکم رہے یا محکوم رہے۔ جہاں وہ حاکم رہے تو وہاں انھوں نے حکومت کے طریقے سیکھ لیے اور قانون، قانون اسلام، کا اطلاق حاکم کی حیثیت سے کرلیا۔ اور جہاں محکوم رہے وہاں انھوں نے محکومی کے طریقے سیکھ لیے اور اپنے طرز عمل کو Adjust کرلیا۔ ان ملکوں میں جہاں وہ حاکم نہیں بلکہ محکوم تھے۔ اور بلکہ ایسا بھی تھا کہ حاکم وقت اس بات کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا کہ اسلام کے جو سارے امور ہیں اس کی کوئی پوری پابندی کرے۔ تو انھوں نے اپنے مذہب اور اپنے عقیدے کو چھپانے کے طریقے بھی کہیں کہیں اپنا لیے تھے۔ ایسا بھی ہوا ہے تاریخ اسلام میں کہ اپنی بات اور اپنے مذہب کو چھپانا پڑا ہے۔ تو، حاکمی اور محکومی دونوں کے طریقے مسلمانوں نے چودہ ۱۴۰۰سو سال میں سیکھ لیے۔ اب پہلی بار تاریخ اسلام میں ہندستان میں مسلمانوں کا وہ وقت آیا ہے کہ وہ نہ حاکم ہیں اور نہ محکوم، وہ نہ رولر ہیں اور نہ رولڈ، بلکہ وہ Co-ruler ہیں۔ مشترکہ رولر ہیں۔ مشترکہ حاکم ہیں، وہ بھی حاکم ہیں دوسرا بھی حاکم ہے۔ یہ بھی پارلیامنٹ میں اور وہ بھی پارلیامنٹ میں، یہ بھی Cabinet میں، وہ بھی Cabinet میں، یہ بھی یونیورسٹیوں کی سلکشن کمیٹیوں میں، اور، پبلک سروس کمیشن کی سلکشن کمیٹیوں میں اور وہ بھی۔ مانا کہ ہندستانی مسلمان یہ محسوس نہیں کرتے، عام طور سے، کہ وہ دوسروں کے برابر ہیں اور پہلے درجے کے شہری ہونے کا پورا حق ملا ہوا ہے۔ تاہم قانون کے حساب سے ملا ہوا ہے۔ لیکن عمل در آمد کچھ ایسا ہے اور ان کی اپنی کمزوریاں معاشی سماجی وغیرہ کچھ ایسی ہیں کہ وہ عام طور سے ایسا محسوس نہیں کرتے۔ صرف قانون میں حق ملا ہے۔ لیکن حق ضرور ہے کہ وہ یہاں Co-ruler بن گئے ہیں۔ وہ بھی حاکم دوسرے بھی حاکم۔ لیکن Co-ruler بننے کے طریقے میری رائے میں ابھی ہندستانی مسلمانوں نے پوری طرح سے نہیں سیکھے ہیں کہ کس طرح Co-ruler رہا جاتے۔ مسلمان کا رشتہ مسلمان سے کیا ہو یہ تو چودہ ۱۴۰۰سو سال میں ہوا۔ عمل در آمد بھی ہوتا رہا۔ لیکن مسلمانوں کا رشتہ غیر مسلم سے کیا ہو جبکہ وہ بھی رولر ہیں اور آپ بھی رولر، اس مشکل مضمون کو کیسے نبھایا جائے، میں سمجھتا ہوں اس کے صحیح طریقے ابھی ہمارے سامنے نہیں آئے ہیں۔ فکر جاری ہے۔ عمل جاری ہے۔ دیکھیے آگے اس کا کیا رنگ آتا ہے۔ میں یہ عرض کروں کہ

* خدا بخش آرکائیوز سے ایک تحفہ : خسرو صاحب کا غیر مطبوعہ خطبہ

ہندستانی مسلمانوں کو سوچنے کی ضرورت ہے کہ، دامن اسلام کو ہاتھ سے نہ چھوڑتے ہوئے، اچھے ہندستانی کی حیثیت سے اور پہلے درجہ کے شہری کی حیثیت سے یہاں رہیں اور دوسرے کے ساتھ، کہ وہ بھی حاکم ہے آپ کی طرح' کس طرح کا عمل درآمد رکھیں، ان چیزوں کو ابھی ہم کو غور کرنا ہے۔ اور کتنی منزلیں ہمیں سر کرنی ہیں!

اچھا، تو سوال کر رہے ہو؟ Scientist یہ نہیں کہتا ہے! اچھا تو میں نے ایک نظریہ پیش کیا اور تم اس کے خلاف آواز اٹھا رہے ہو؟ نکل جاؤ یہاں سے، یہ نہیں ہو سکتا سائنس میں! یہ نہیں ہوتا۔ یہ دیکھا جائیگا کہ تمہاری دلیل کیا ہے اور میری دلیل کیا ہے۔ دونوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہو جائے۔ اور اگر تجربہ کا موقع ہے تو تجربہ کر لیا جائے کہ وہ کیا دکھاتا ہے Experiment کہاں لے جاتا ہے۔ اس کے حساب سے فیصلہ ہوگا، تو سائنٹفک Method میں Tolerence of the opposite idea is the real thing اور یہ مسلمانوں کی زیادہ دریافت ہے Scientific Method۔ اب جب ہم اس Scientific Method کو Empiricism کو سیاست کی دنیا میں لاگو کرتے ہیں تو اس سے جمہوریت نکلتی ہے Scientific Method جس میں دوسرے کی بات سنی جا سکتی ہے۔ اس میں دوسرے کی تھیوری کو سمجھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے، اپنی تھیوری کے خلاف دوسرے کی بات سنی جاتی ہے۔ اور جب وہ صحیح ثابت ہو گیا تو کہا جاتا ہے کہ میں غلط راستے پر تھا Einstien نے کئی بار کہا ہے کہ پرانی تھیوری غلط تھی، یہ بات اب نکل کر سامنے آئی اور مسلمانوں نے بھی اپنے زمانہ میں یہی کیا، جب تجربے کر رہے تھے بڑے بڑے۔ یہ تجربہ ٹھیک رہا، میری بات غلط۔ تو یہ Scientific Method جب سیاست میں استعمال ہوتا ہے تو اس میں سے جمہوریت پیدا ہوتی ہے۔ جمہوریت میں بھی یہی ہے کہ اپنا عقیدہ مستقل نہیں مانا جاتا ہے عارضی مانا جاتا ہے سارے کے سارے عقیدے عارضی ہوتے ہیں اس امید پر کہ مزید انکشافات، مزید بحثیں، مزید دلائل اور مزید تجربے میری رائے کو غلط ثابت کر دیں، اور شاید اس کی رائے کو صحیح ثابت کر دیں۔ یہ ہے Scientific طریقہ۔ اس بات سے آپ کی پارٹی جمہوریت میں نوے فیصد ووٹ لے کر جیت کر آئی اور دوسری پارٹی دس فیصد ووٹ لیے بیٹھی ہے اور یہ ممکن ہے آپ کے لیے کہ ایسا قانون بنا دیں اسمبلی اور پارلیامنٹ میں کہ یہ جو ہیں دس فیصد والے یہ کون ہوتے ہیں۔ یہ تو دس فیصد ہیں اور ہم تو نوے فیصد پر جیت کر آئے ہیں۔ اور ہیں نوے فیصد ہوں چنانچہ ایسا قانون بنایا جائے کہ ان کی گردن کاٹ دی جائے! جمہوریت میں یہ نہیں ہوتا۔ جمہوریت میں Opposition کو بٹھا کر رکھتے ہیں، چاہے وہ دس فیصد کا ہو یا بیس فیصد کا یا دو فیصد کا۔ اس کی بات سنی جاتی ہے، اس خیال سے کہ

ہوسکتا ہے یہ جو کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہو۔ جمہوریت کی بنیاد یہ ہے کہ ہوسکتا ہے جو کہہ رہے ہیں سچ ہو، میں کوئی سچائی کا بیوپاری تھوڑے ہی ہوں اور میں سچائی کا کوئی اجارہ دار تھوڑے ہی ہوں، ہوسکتا ہے کہ یہ جو مد مقابل ہے وہ صحیح ہو۔ اور اس کا خیال سائنس میں بھی رکھا جاتا ہے اور جمہوریت میں بھی جو سائنس ہی کی پیداوار ہے اور Scientific ہے، اس میں بھی رکھا جاتا ہے۔ تو، جناب، یہ صورتحال ہے! اور گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں نے اس بات کو سمجھا، کہ اس ملک کی جو روش ہے دو ہزار سال سے' accomodation کی روش ہے، دوسرے کی بات کو سمجھنے اور سوچنے کی! اپنے ایمان پر قائم رہو لیکن دوسرا اگر اپنے ایمان پر قائم رہنا چاہتا ہے تو اس کو اپنے ایمان پر قائم رہنے دو، اس کی بات بھی سنو۔ میرا خیال ہے کہ اگر گاندھی اور یہ لوگ چاہتے تو رام راجیہ بنا سکتے تھے۔ بیس تیس سال پرچار کر لیتے اور کہتے کہ بھائی اتنا بڑا سرمایہ اور اثاثہ ہے، اتنا پرانا اور اتنا بڑا کلچر ہے، ہمارے پاس Mathematics ہے، ہمارے پاس سے ڈیسیمل سسٹم نکلا، ہمارے پاس ... کا اتنا کام ہے ہمارا Scientific Development اور ہمارا Cultural Achievement یہ یہ ہے، اور ہماری زبان دنیا کی اعلیٰ زبانوں میں سے ہے اور ہمارا بڑا عمدہ کلچر رہا ہے۔ تو، رام راجیہ بنے گا۔ پچھتر چھہتر (۷۵-۷۶) فیصد آبادی بھی اس کی پیرو اور مقلد رہی ہے، تو رام راجیہ یہ لوگ کر لیتے۔ لیکن ان بزرگوں کی بزرگی تھی، بڑائی تھی کہ ایسا نہ ہونے دیا۔ اور زمانے کی نبض کو اور تاریخ کی نبض کو پہچانا اور ایک مشکل راہ سیکولرزم کی اختیار کی۔ کرسچین کیا کر لیتے، مسلمان کیا کر لیتے، سکھ کیا کر لیتے Budhist کیا کر لیتے۔ اگر یہاں رام راجیہ ہو جاتا۔ مانا کہ مشکل ہوتی اس میں بھی، آگے چل کر نفرتیں بڑھتیں تو Long Range میں تو نفرتیں ضرور بڑھ جاتیں، لیکن اس چیز کو گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں نے سمجھا اور کہا کہ صاحب راستہ سیکولرزم کا اپناتے ہیں جو Minorities کے لیے سند بن گیا۔ اگر سیکولرزم نہ ہوتا اور رام راجیہ بن گیا ہوتا تو آپ کیا کر لیتے۔ معلوم یہ ہوا کہ یہ راستہ Minorities کے لیے صحیح تھا۔ اور اس کا فائدہ انکو ہونا چاہیے۔ اگر وہ بات ہے کہ سیکولرزم ان کے لیے ہے تو سیکولرزم Majority کے لیے نہیں ہے، بلکہ ان کے لیے ہے۔ اس میں ان کی حفاظت کی ایک صورت ہے اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم اپنا Co-ruler ہونا پسند کرتے ہیں، کیا نکات ہیں اسکے، کیا شرطیں ہیں Co-ruler بننے کی، کہ ہم برابری کے ساتھ رہیں۔ یہ موضوع ہے جو ہم آپ کے سامنے لانا چاہتے ہیں۔

انسان کی کئی طرح کی وفاداریاں ہوتی ہیں۔ اپنے مذہب سے وفاداری، اپنی زبان سے وفاداری، اپنی نسل سے وفاداری، کئی وفاداریاں ہر ایک کی ہوتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس میں سے جائز وفاداری کون سی ہے اور ناجائز وفاداری کون سی ہے۔ تو عام طور سے بحث کی دنیا میں یہ بات صاف ہوگی کہ نسل سے وفاداری، اور نسل کی ایک شکل ہے

ذات پات، اس سے وفاداری ناجائز وفاداری ہے۔ دنیا کے سوچنے والے اس مقام پر پہنچے ہیں کہ ایسا سوچنا کہ چونکہ میں اس نسل میں پیدا ہوگیا' اسلیے میں دوسروں سے بالا و برتر ہوں، یہ نہیں چلے گا۔ دوسری نسل والا اسکو نہیں مانے گا۔ تو نسلی وفاداری میں نقصانات زیادہ اور فائدے کم ہیں۔ اسلیے ________________

بات وہیں پہنچی جہاں قرآن حکیم اور حدیث رسولؐ نے اس کو پہنچایا تھا کہ کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر اور کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر فوقیت یا ترجیح نہیں ہے۔ اگر ہے تو تقویٰ پر، عمل پر۔ تو گویا بات وہیں پہنچی کہ ذات اور نسل سے وفاداری ناجائز ہے۔ اب باقی جو وفاداریاں ہیں۔ علاقائی اور مذہبی، اس سب کو جائز وفاداری مانا گیا ہے۔ کس نے کہا ہے کہ کرسچین ہونا ناجائز ہے؟ کس نے کہا ہے کہ مسلمان یا ہندو ہونا ناجائز ہے۔ تو مذہبی وفاداریاں جائز ہیں۔ یہ جائز مانی گئی ہیں اس ملک میں۔ اسی طرح کبھی کسی نے نہیں کہا کہ تامل ناڈ کا ہونا ناجائز ہے۔ اپنی تامل آئیڈنٹیٹی (Iden tity) کو آپ مت اٹھائیے۔ مانا کہ آج کل مہاراشٹرین لائیلیٹی، بہار لائیلیٹی، یو پی لائیلیٹی جائز وفاداریاں ہیں۔ کس نے کہا ہے کہ ملیالم زبان سے وفاداری ناجائز ہے اور کس نے کہا ہے کہ ہندی سے اور اردو سے وفاداری ناجائز ہے۔ یہ بھی جائز ہے۔ زبان سے وفاداری جائز مانی گئی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ سوائے نسلی وفاداری کے سبھی جائز وفاداریاں ہیں۔ اور خاص طور سے ملک سے وفاداری، اپنے علاقے سے وفاداری، اپنے مذہب سے وفاداری، اپنی زبان اور اپنی کلچر سے وفاداری یہ سب جائز ہے۔ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے یہاں ذہن کو صاف کرنے کی ضرورت ہے کہ نسلی وفاداری ناجائز قرار پائی اور رسول اللہؐ سے لے کر گاندھی جی تک اور بھی بیچ میں بہت بڑے بڑے لوگ آئے سبھی کے یہاں ناجائز قرار پائی لیکن دوسری وفاداریاں جائز ہیں۔ اور اسکے خلاف آواز نہیں اٹھ سکتی، اور نہ اٹھائی گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر وفاداریوں کا آپس میں تصادم ہو جائے

In the case of conflict which will be the supreme.

بہت نازک مضمون ہے جو پچاس سال سے اس ملک کو ستا رہا ہے Two Nation Theory اور Three Nation Theory تو اگر Conflict ہو جائے اگر تصادم ہو جائے ان وفاداریوں میں، تو کون سی وفاداری بالآخر مانی جائے گی، اس پر عام طور سے دنیا میں اتفاق ہے کہ ـــــ ملک سے وفاداری ایک مستحکم وفاداری ہے۔ اور اگر Conflict ہو جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ تصادم ہو جائے۔ تصادم نہ ہونے دینے کی بیسیوں شکلیں پیدا کی جاسکتی ہیں کہ وفاداری میں تصادم نہ ہوئے۔ لیکن اگر تصادم ہوگیا تو ایسی صورت میں ملک سے وفاداری لازمی ہے؟ اس میں مجھے آپ سے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور سعودی عرب کے لوگ بھی مسلمان ہیں سارے کے سارے تقریباً، کیا سعودی لوگ مجھے نیشنلیٹی دیدیں گے؟ اسلیے کہ میں مسلمان ہوں؟ نہیں دیں گے۔ عام طور سے

سعودی عربیہ میں پیدا ہونا ہی حق دے گا وہاں کی Nationality کا۔ کیا پاکستانیوں کو جو مسلمان ہیں ان کو سعودی اپنی Nationality دے دیں گے؟

میرے ایک دوست تھے مسٹر جمشید مارکر اب بھی ہیں جو پاکستان کے سفیر ہیں United States میں۔ اور جب میں جرمنی میں سفیر تھا ہندستان کا، تو وہ پاکستان کے سفیر تھے جرمنی میں، اور میرے یہاں کے رہنے والے تھے، وہیں حیدرآباد میں پیدا ہوئے تھے، حیدرآباد دکن میں، اور ان سے میرا یارانہ تھا۔ تو جمشید مارکر نے اس سے اتفاق کیا۔ جمشید مارکر پارسی ہیں مسلمان نہیں ہیں۔ پاکستان ان سے یہ امید نہیں رکھتا کہ وہ اسلام سے وفاداری رکھیں گے کیونکہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ لیکن پاکستان ان سے ضرور یہ خواہش رکھے گا، نہ صرف خواہش بلکہ لازمی طور سے ان سے یہ منوائے گا کہ پاکستان سے انکی وفاداری ہو۔

تو یہ لازمی ہے کہ وطن سے وفاداری ہو۔ دنیا کے سارے پاسپورٹ ہر ملک کے پاسپورٹ، وطنیت کے حساب سے ملتے ہیں۔ تو بس یہ عرض کرنا تھا کہ اگر Conflict ہوجائے Supreme Loyalty کی، تو دینی معاملات میں کسی نے یہ نہیں کہا ہے کہ اپنا مذہب چھوڑ دو لیکن دنیاوی معاملات میں Supreme Loyalty وہ ہوگی۔ لوگ کہتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور کہا تھا کہ:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے   جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

ضرور کہا تھا علامہ اقبال نے، لیکن یہ انھوں نے 'بانگِ درا' میں کہا تھا، ان کا جو ابتدائی دیوان ہے لیکن اور چیزیں بھی ہیں علامہ کی۔ چنانچہ ان کی تقریباً آخری یا آخر سے قبل جو آخری دور کی کتاب ہے، 'ضربِ کلیم' میں کہا ہے اقبال نے، نظم کا عنوان میں بھول رہا ہوں، 'سورج اور شعاعیں' ہے شاید:

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام   دنیا ہے عجب چیز! کبھی صبح کبھی شام!
نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت   نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام!
پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ   چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام!

تو سب شعاعیں جو ہیں سورج کے اندر سما جاتی ہیں مگر:

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور   آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب!

بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو

اور پھر آگے چل کر کرن کہتی ہے کہ:

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو — جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب!
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز — اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب!
بت خانے کے دروازہ پہ سوتا ہے برہمن — تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب!

یہ مت سمجھیے کہ وطنیت کا تصور غائب ہوگیا، اقبال کے یہاں سے، بلکہ آخری عمر میں وہ اپنی جگہ شدت سے موجود ہے۔ اب معلوم یہ ہوا کہ وطنیت کوئی ایسی چیز نہیں، دنیا کی ساری چیزیں Nationality پر ہیں۔ پاکستان کی Nationality آج اس پر چل رہی ہے اور ہندستان کی Nationality بھی اسی پر چل رہی ہے۔

اب جناب آگے چلتے ہیں ذرا ایک منزل، ذہن کو صاف کرنے کے لیے۔ کم سے کم میں اپنے ذہن کو صاف کرنے کی کوشش کروں گا اور اس میں آپ کی رائے میرے لیے بہت مناسب ہوگی۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ وفاداریاں آپس میں ٹکرلیں اور ان میں کش مکش ہوجائے Conflict ہوجائے۔ اس کو Avoid کرنے کی، ہٹانے کی کوشش ہوسکتی ہے، چنانچہ جن بزرگوں کا ذکر ہو رہا تھا گاندھی جی اور دوسروں کا جنھوں نے مل کر دستور وغیرہ بنایا ہے اور ملک کی نبض کو دیکھا اور اس کو پہچانا، انھوں نے اس کو دیکھ لیا تھا کہ Conflicts ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ اس کے راستے نکالے۔ کہا کہ اچھا تم ملک کے علاوہ اپنے علاقے سے بھی وفاداری رکھتے ہو تم مہاراشٹرین ہو، تم بہاری ہو، ٹھیک ہے یہ جائز وفاداری ہے۔ بہار سے اور مہاراشٹر سے وفاداری جائز ہے۔ تو پھر ایک وفاقی حکومت بنا لیتے ہیں۔ ایک مرکزی حکومت ہوگی۔ اس کا اپنا دستور ہوگا۔ اس کے اپنے قوانین ہوں گے۔ اس کی اپنی Cabinet ہوگی اس کا اپنا Justice کا ادارہ ہوگا لیکن تم اپنا الیکشن سسٹم بنالو، اپنی اسمبلی چن لو۔ اس اسمبلی میں متعدد مضامین کے قوانین بنالو۔ اپنی Cabinet چن لو، تمہارا اپنا Chief Minister ہوگا Court of Justice تو خیر ایک ہی ہے لیکن تمہاری ریاستی عدالتیں الگ ہوں گی۔ تو آپ کی اپنی جو Maharashtrian Loyalty ہے وہ جائز ہے۔ چنانچہ اس کا انتظام کرکے ایک بہتر طریقہ کھولا گیا۔ دروازہ کھولا گیا کہ اس Loyalty کو پریکٹس کریں۔ مہاراشٹر کی جو آپ کی Loyalty ہے بہار سے جو آپ کی Loyalty ہے اس پر عمل کرنے کا دروازہ کھولا گیا۔ کہا کہ حکومت اسی کا نام ہے جو دو حصوں میں چلتی ہے۔ ایک Centre اور ایک State۔ تو آزادی دی گئی ہے۔ آپس میں محبت رکھو اور اس کے بقا کو بڑھانے کی کوشش کرو، اپنی Cabinet اور اپنی اسمبلی اور اپنا Court of Justice الگ رکھو۔ پھر کہا گیا اچھا تم زبان سے وفاداری رکھتے ہو، تامل ناڈو کے ہو، تامل زبان تم کو پسند ہے یہ بالکل جائز وفاداری ہے۔ رکھو اس وفاداری کو۔ (یہ ٹھیک ہے یا غلط مجھے معلوم نہیں۔ اس پر بحث ہوسکتی ہے) تو کہا کہ چلو بھائی لسانی ریاستیں بنالیتے

ہیں تاکہ تم اپنی لسانی Loyalty کو آگے بڑھاؤ اور اپنی زبان سے محبت کرو اور اسکے واسطے اپنی Resources فراہم کرو Terminology بناؤ اور اسمیں لٹریچر لکھو اور پلاننگ کا دروازہ کھول دیا گیا اسکے لیے، جس طرح علاقائی وفاداری کو آگے بڑھانے کا دروازہ کھولا گیا تھا، کہ تم اپنی لسانی وفاداریوں کو آگے بڑھاؤ، پھر کہا گیا کہ تم Christian ہو اور Christianity سے محبت کرتے ہو، تم مسلمان ہو اسلام سے محبت رکھتے ہو، تو ٹھیک ہے۔ تم ہندو ہو، تم ہندو مت سے محبت رکھتے ہو تو ٹھیک ہے۔ تو ٹھیک ہے، تم اپنے پرسنل لا چلالو۔ اپنے پرسنل لاز تم لاگو کرو بڑی خوشی ہوگی، اس میں دخل نہیں دیا جائے گا، کیونکہ مذہب اور اس کے قانون سے Loyalty جائز لائیلٹی ہے۔ بہ خوشی تم اپنے پرسنل لاز پر عمل کرو، یہ کہا گیا۔ اس سے معلوم ہوا، جناب عالی، کہ Conflict اور تصادم کو Avoid کرنے کے لیے یہ دروازے کھولے گئے کہ ملک سے وفاداری میں اور مذہب سے وفاداری میں تصادم نہ ہو، لسانی وفاداری اور علاقائی وفاداری میں تصادم نہ ہو۔ یہ دروازے دستور میں کھولے گئے اور قوانین میں کھولے گئے۔ آج کل کے لوگ جو لڑتے ہیں وہ اس نکتے کو نہیں سمجھ رہے ہیں کہ ہندستانی قومیت صرف اسی وقت مستحکم ہوگی جب کہ ان دوسری وفاداریوں کو Practice کرنے کے دروازے کھلے رہیں اور اسی حد تک ہندستانی قومیت مستحکم ہوگی جس حد تک یہ آزادیاں باقی ہیں۔ ٹھیک ہے صاحب، کل آپ یہ کر دیکھیے کہ مہاراشٹرین بننا ناجائز Only loyalty to homeland, not to Maharashtra. not to Bihar۔ یہ کر کے دیکھیے، کیا ہوتا ہے ملک کا، اگر اسے کریں Federal Constitution کو Abolish کر دیں تو پھر آپ دیکھیں گے کیا حشر ملک کا ہوگا۔ اور ہندستانی قومیت کیا ہوگی۔ آپ یہ کر کے دیکھیے کہ تامل زبان سے، ملیالم زبان سے اور ہندی زبان سے، اردو زبان سے وفاداری ناجائز ہے، پھر آپ دیکھیے کیا حشر ملک کی National Identity کا ہوتا ہے۔ آپ کر کے دیکھیے کہ Christian ہونا ناجائز ہے۔ پھر آپ دیکھیں کہ کیا حشر ہوتا ہے ملک کا۔

لیکن آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس میں دونوں پہلو ہیں، جو لوگ ان آزادیوں کی مخالفت کر رہے ہیں، اور Single Loyalty تو ہے ہی، Single Constitution کی بات کر رہے ہیں، اور یہ کہ زبان سے، علاقے سے اور مذہب سے وفاداری کوئی چیز نہیں ہوتی ہے، اور مذہبی قانون کیا ہوتا ہے، ایک ہی قانون ہونا چاہیئے، تو ہم یہ کہہ رہے ہیں You understand what they are saying۔ اسکے علاوہ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ نہیں صاحب ملک سے وفاداری کیا چیز ہوتی ہے وہ بھی بات کو نہیں سمجھ رہے ہیں تو یہ Total thought ہے دونوں چیزیں ہوں گی تب جا کر بات بنے گی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں نے بڑے بڑے کام کیے۔ آزادی کی لڑائی میں Minorities والوں نے بہت بڑا حصہ لیا لیکن اپنے مذہب کو مستحکم کرنے کے لیے کیا کیا عمل درآمد ہوئے۔ بڑی لمبی فہرست ہے اور اپنی زبان کو آگے بڑھانے کے لیے کیا کیا کیا گیا Minorities کی طرف سے اور یہاں صرف مسلمانوں کی بات نہیں ہو رہی ہے ان میں سب کا ذکر ہے، ان لوگوں نے کیا کیا Indian Nation کو مستحکم کرنے کے لیے۔ اس کے اوپر میں سمجھتا ہوں کہ کام ہوا ہے، چند نام آئیں گے۔ لیکن مشکل کیا ہے کہ ہم ہندستانی بھی ہیں اور مسلمان بھی ہیں۔ ہمارے لیے دو گھوڑے کی سواری ضروری ہے تو ہم کو Indian Nationality کے لیے بھی کوشش کرنی ہے ہم کو ایک اچھا مسلمان بننے کے لیے کوشش کرنی ہے اچھا کرسچین بننے کے لیے کوشش کرنی ہے اور یہ مضمون مشکل ہے تو اس میں کیا ہو رہا ہے کہ ایک طرف تو کام آگے بڑھ گیا دوسرا آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔

ایک بات اور۔ جب اپنے مذہب کی بات ہوگی تو اس کے اعلیٰ مقام کی اور جو شروع میں اسکی اصل تھی قرآن حکیم اور احادیث میں، اس کی ہم بات کریں گے۔ لیکن دوسروں کے مذہب کی بات ہم کریں گے تو جو خرابیاں وقت کے تقاضے سے ہوئی ہیں اسکے عملدرآمد کی بات ہم کریں گے۔ دوسرے لوگ جب اپنے مذہب کی بات کریں گے تو اسکا Spiritual form بتائیں گے۔ اور جب میرے مذہب کی بات کریں گے تو میرے مذہب میں عملدرآمد میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں اور جو Deviation ہو گیا ہے اصل تعلیم سے اور قرآن کی تعلیم سے، وہ ہم کو بتائیں گے۔

ہندستان کے سترہ صوبوں میں سے پندرہ میں ہندی پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے نمبروں پر بولی جاتی ہے۔ دوسری جو بڑی زبانیں بنگالی، گجراتی، تامل، پنجابی ہیں، یہ بڑی زبانیں تین چار یا پانچ ریاستوں میں پہلے دوسرے اور تیسرے نمبروں پر بولی جاتی ہیں۔ اردو سترہ ریاستوں میں سے پندرہ ریاستوں میں آتی ہے۔ پہلے درجہ پر تو کہیں نہیں آئی، کسی بھی جگہ وہ اکثریت کی زبان نہیں رہی، کشمیر میں بھی نہیں، وہاں کشمیری ہے لیکن دوسرے، تیسرے نمبر پر پندرہ ریاستوں میں اردو کا بول بالا ہے۔ نہ پنجابی، نہ گجراتی، نہ کنڑ اور نہ کوئی زبان عام پھیلاؤ میں عام ہر دلعزیزی میں اس کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ یہ Census ڈاٹا سے ثابت ہے۔ لیکن اس زبان کے ساتھ مشکل یہی ہو رہی ہے کہ جو طالب علم نوجوانی کی عمر میں جو زبان استعمال کرتا ہے اسے Absorb کرتا ہے۔ جو ڈسپلن ہونا چاہیے وہ جغرافیہ ہو یا کچھ ہو وہ اپنی ہی زبان میں کر سکتا ہے، دوسرے کی زبان میں نہیں۔ اب یہاں یہ ہوا کہ اورنگ آباد میں چوتھے درجے تک تعلیم ہو رہی تھی وہاں اس نے اردو پڑھنا شروع کر دیا کیونکہ وہ پرائمری اسکول تھا

اور اورنگ آباد کو چھوڑیئے دوسری ہی جگہ کو لیجئے لیکن جب وہ پانچویں درجے میں پہنچا تو وہاں اسکو اردو کی تعلیم نہ مل سکی اور مراٹھی اسکولوں میں چلا گیا۔ اب جو لڑکا مراٹھی اسکول میں پڑھتا آرہا تھا اور جس کی مادری زبان بھی مراٹھی تھی پانچویں سال بھی مراٹھی پڑھ رہا تھا، اور یہ پانچویں سال ہی سے مراٹھی پڑھنے لگا اور یہ سکنڈ کلاس شہری بن گیا۔ اگر خوش قسمت ہوتا اور مہاراشٹر ہی میں اردو پڑھتا تو ساتویں کلاس تک ہی اردو میں پڑھتا اور جب آٹھویں میں آتا تو اردو کا انتظام نہ تھا اور وہ اردو کو ترک کر دیتا اور آٹھویں کلاس میں مراٹھی میں شریک ہوتا۔ اگرچہ وہ مراٹھی کو زبان کی طرح پڑھ رہا تھا Medium of Instruction کے طور پر نہیں پڑھ رہا تھا اور وہ اس کو Absorb نہیں کر پا رہا تھا، چنانچہ جیسے Switch over ہوا سکنڈ کلاس شہری ہو گیا اور خوش قسمت تھا کسی ہائی اسکول میں پڑھ رہا تھا تو وہ دسویں کلاس تک نکل گیا اور پھر گیارہویں میں اسکو Switch over کرنا پڑا دوسری زبان میں۔ پھر سکنڈ کلاس شہری بن گیا۔ یا پھر بارہویں جماعت میں کسی کالج میں گیا تو پھر اس کو کسی دوسری ریاستی زبان میں پڑھنا پڑا۔ بہرحال سکنڈ کلاس شہری بننا اردو والوں کے لیے ضروری ہو گیا۔ سکنڈ کلاس شہری زبان کے اعتبار سے، کہیں نہ کہیں جہاں Switch over کرنا پڑا یہ ضروری بن گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ Failure Data زیادہ ہو گیا Drop out rate زیادہ ہو گیا۔ ہم آپ سبھی جانتے ہیں، ہم اکثر اس کا ذکر کرتے ہیں اپنی باتوں میں، مگر اصل نکتہ یہ تھا کہ جس زبان میں تعلیم ہوتی تھی نہیں ہوئی Switch over ہوتا گیا اور ان سے ٹکر لینا پڑی جو زبان نیچے سے پڑھتے آرہے تھے 'وہ رہے فرسٹ گریڈ' اور ہم رہے سکنڈ گریڈ۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ Injustice (انیائے) ہے اردو ایسی زبان کے ساتھ۔

اچھا میں یہ مانتا ہوں کہ اردو مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ یہ بھی عام زبان ہے ہندو مسلم سبھی اس کو بولتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ہندستان میں مسلمانوں کی اکثریت بھی اردو نہیں بولتی۔ اگر ۱۹۶۱ء میں جب سات کروڑ آبادی تھی تو ساڑھے تین کروڑ آبادی تھی اردو بولنے کی۔ اب بھی وہی حال ہے۔ تھوڑا سا بڑھا ہوگا یا تھوڑا سا گھٹا ہوگا۔ اُس وقت بھی ۱۹۶۱ء میں بھی Majority تھی مسلمانوں کی تعداد جو اردو بولتی تھی، باقی کوئی تامل بولنے والے تھے، کوئی تیلگو بولنے والے تھے، مادری زبان کے طور سے۔ تو آپ یہ نہ سمجھیں کہ اردو مسلمانوں ہی کی زبان ہے۔ یا یہ کہ مسلمان صرف اردو ہی بولتے ہیں۔ مسلمان اردو کے علاوہ دوسری زبانیں بھی بولتے ہیں۔ اگرچہ ان کی دلچسپی اور ان کا Sentiment اردو کے ساتھ ضرور ہے۔ مدراس کا مسلمان تامل بولتا ہوگا مادری زبان کی حیثیت سے بھی بولتا ہوگا لیکن وہ اردو بھی جانتا ہے اور کچھ بولتا بھی ہے اور Sentiment اردو کے ساتھ موجود ہے۔

As sentiment, it has a wider range than as a mother tongue.

اس کا انتظام برابر نہیں ہے اس ملک میں۔ اب میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اس Contest میں اس کو ہٹانے کی سخت ضرورت ہے۔ یہ تعجب ہے کہ حکومتِ وقت کی نہ صرف ریاستوں میں بلکہ سنٹر میں بھی جیسی پالیسی ہونی چاہیئے نہیں ہے۔ ہونا کیا چاہیئے کہ اردو یونیورسٹی ہو اور جب اردو یونیورسٹی قائم ہو جائے گی تو اس کا Linkage نیچے سے آئے گا۔ ہائی اسکول کا لجِ یا مڈل اسکول زیادہ تعداد میں کھلیں گے اور اب میں یہ بات کرنا چاہتا ہوں زبان کے اعتبار سے کیوں کہ مجھے اپنے گریباں میں بھی تو منہ ڈال کر دیکھنا ہے۔ یہ تھوڑے ہی ہے کہ صرف حکومت سے ہی مانگتے رہیں۔ اور وہ وقت آگیا ہے کہ حکومت سے پہلے اپنا انتظام خود کریں۔ ابھی وہ بھی وقت آگیا ہے کہ اپنے پاؤں پر آپ نہ کھڑے ہوں تو کام نہیں چلے گا۔ اسلیے زیادہ تر اپنے کام خود کرنے چاہئیں۔ تو اس پر یہ عرض کرنا ہے کہ زبان کی کامیابی کے لیے چار شرطیں ہیں:

ایک تو زبان ثقافتی زبان ہو، اچھی زبان ہو۔ یہ بات اردو میں ہے۔ دوسری شرط زبان کے لیے یہ ہے کہ یہ بازار کی زبان ہو۔ کامیابی کے لیے، آگے بڑھنے کے لیے، یہ ضروری ہے کہ زبان بازار کی ہو اور وہ اردو ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اس میں Scientific Terminology وغیرہ ہو جو اردو میں ہے۔ اور ہندستان کی دوسری زبانوں میں آنے لگی ہے۔ اردو میں یہ دو سو سال سے آرہی ہے اور اب بھی ہے۔ لیکن چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ روزگار کی زبان ہو، روزی روٹی حاصل کرنے کے لیے ہو۔ یہ بات عام طور سے اردو کے لیے نہیں ہے۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ اردو روزگار کی زبان نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے چونکہ وہ روزگار کی زبان نہیں ہے، اسکی مانگ نہیں آرہی ہے۔ مانگ اس کی اسوقت آئے گی جب وہ روزگار کی زبان ہو۔ اور ہم صرف رسد سے کام چلا رہے ہیں۔ ترقی اردو بورڈ بن گیا۔ ترجمے ہونے لگے اور اس کے اندر تالیفات اور تصنیفات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لغت بھی تیار ہو گئی اور Encyclopaedia بھی تیار ہو گئی۔ نہ لغت چھاپ رہے ہیں نہ Encyclopaedia چھاپ رہے ہیں Ministry of Education والے۔ آٹھ جلدوں میں تیار ہے اردو کی Encyclopaedia لیکن چھپ نہیں رہی ہے۔ اور کیوں ہو رہا ہے یہ؟ میں دریافت کروں گا کہ میں خود اس کے Editorial Board کا صدر تھا اور بار بار آواز اٹھاتا ہوں لیکن جم کر نہیں اٹھائی ہے آواز ابتک۔ دیکھا جائے گا کہ اس سال کیا ہو گا۔ ایک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے۔" تو جناب یہ مشکلات ہیں زبان کی۔ تو ہمکو کرنا یہ چاہیئے اور حکومت کو کرنا چاہیئے کہ یونین پبلک سروس کمیشن اور دوسرے پبلک سروس کمیشن میں اردو کے ذریعہ امتحانات کو جائز قرار دیں۔ درک ہو جائے گی اسکے اندر کی مادری زبان ہے جن کی اور وہ یہ کہیں گے کہ بھائی میں اگر اس کے ذریعہ امتحان دوں تو میرے لیے بہتر ہوگا کیونکہ اسکی جانکاری میرے اندر موجود ہے اور تب کہیں جا کر مسئی پیدا ہوں گے۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ پبلک سروس کمیشن والے موضوعات اور

اردو یونیورسٹی اگر ہوسکے تو Switch over کرنے کی ضرورت نہ پیدا ہو۔ آخری منزل تک پی۔ ایچ۔ ڈی کے Level تک اردو میں انتظام تعلیم کا ہوسکے۔ اور مجھے تعجب ہے کہ عام طور سے اس میں اتنا تعصب پھیلا ہوا ہے، زبان کے معاملے میں، کہ لوگ ہندستان کی قومیت کو مضبوط کرنے کا جو مضمون ہے اس کو بھول کر فضولیات کی طرف جاتے ہیں لیکچر لگانے اور روڑے اٹکانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اور وہ بھی انتظامات نہیں کرتے جو کرنے چاہیئے۔ آخر میں یہ عرض کروں گا ایک اور Contradiction یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تحفظات اور Reservation ہوتے ہیں۔ یہ میری رائے میں بڑی حد تک جائز ہیں ان لوگوں کے لیے جو صدیوں سے پیچھے رہ گئے تھے اور ایک Generation میں انکو اٹھایا نہیں جاسکتا ہے۔ تو یہ کہا گیا کہ تعلیم کے معاملے میں Admission کے لیے Reservation ہوگا۔ اور پھر یہ بھی کہا گیا کہ جب نوکری حاصل کرنے کے لیے وہ بیک ورڈ اور شیڈول کاسٹ یا جو پیچھے رہ گئے تھے وہ آئیں گے تو نوکریوں میں بھی Reservation ہوگا۔ یہاں تک بات ٹھیک تھی کہ تعلیم میں Reservation ہو ورنہ یہ غریب، غربا بے چارے نہ داخلہ لے سکیں گے۔ نہ ان کے ذہن میں یہ بات ہے کہ تعلیم حاصل کریں، نہ آگے اس کی خوبی اور فوائد سمجھتے ہیں، ان کو بڑھانے کے لیے موقع دینا چاہیئے کہ فیس معاف ہو اور جب پڑھ لوگے تو صحیح نوکری تم کو ملے گی۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن اب بات بڑھتے بڑھتے سر سے اونچی ہوگئی اور یہاں تک پہنچی کہ Reservation نہ صرف داخلے کے موقعوں پر اسکولوں میں، کالجوں میں، نہ صرف نوکریوں میں، بلکہ اب لیکچرر بن کر ریڈر بننے جارہے ہیں تو وہاں بھی Reservation مانگ رہے ہیں۔ اس سے گزرۃ چلتی ہے تو غریب غربا کا تو ہمارے دیش میں بہت بڑا گروہ ہے۔ صحیح خاکہ شاید ہی ہم پیش کرسکیں لیکن بات جب آگے بڑھ گئی اور ساٹھ فیصد Reservetion (ریزرویشن) ہونے لگا Backward communities میں، تو پھر Forward communities نے آواز بلند کی۔ ہندستان میں برہمن اور دوسرے جو بڑی ذات کے لوگ ہیں وہ اپنے کو Forward Communities کہتے ہیں۔ Forward communities جو چیخ رہے ہیں، کہ ریزرویشن کا پرسنٹیج اتنا بڑھا دیا گیا ہے کہ اس سے کاموں میں Inefficiency پھیل رہی ہے۔ ہونا کیا چاہیئے؟ ہونا یہ چاہیئے کہ جو تناسب بیک ورڈ کمیونٹیز کا ہے اس کا ان کو ریزرویشن ملے، اور دو اسٹیج پر ملے ایک تو داخلے کے موقع سے اور دوسرے پہلی نوکری کے موقع سے۔ اور دوسرے ریزرویشن ہٹالیے جائیں اور بیس تیس یا چالیس تک نہ پہنچے کیونکہ وہ ناجائز ہے۔ تیسرے جب کوئی ان سہولتوں کا فائدہ اٹھا کے اپنی معاشی حالت ٹھیک کرلے تو ان کو Dereserved کرنا چاہیئے۔ جب آپ نے اعلیٰ تعلیم ایم اے، پی ایچ ڈی بھی کرلی، نوکری بھی حاصل کرلی اور پروموشن بھی ہوگیا اب آپ کے بچے اس سے فائدہ

اٹھائیں یہ نہیں ہوگا۔ اس موقع کے لیے After the first generation over there should be a system of dereservation. مگر اس ملک میں جب آپ نے سیاسی بنیاد کے اوپر کوئی چیز دیدی تو وہ پھر Permanent بن جائے گی وہ وہاں سے ہٹتے ہی نہیں اور پھر اور مانگتے ہیں۔ مفتی کے کاروبار اس ملک میں بہت چلنے لگے۔ آپ نے دیکھا کہ یوروپین سیاست داں چاہے وہ چرچل ہوں یا میٹر... ہوں یا اور بڑے لیڈر جو وہاں کے رہے ہیں، کسی نے یہ نہیں کہا اپنی بنتا ہے کہ یہ لو، وہ لو۔

یعنی مفتی کا کھانے لگ گئے بلوگ اور Crutches پر کھڑے ہوئے ہیں اور Crutches بڑھتی جارہی ہیں۔ اور پھر اور Crutches مانگ رہے ہیں اور سیاست کی یہ Crutches (بیساکھیاں) ملتی ہی جارہی ہیں۔ چنانچہ اس سے ایک طرف Efficiency کا نقصان ہو رہا ہے دوسری طرف خود اعتمادی جو ایک اعلیٰ قوم میں ہونی چاہیئے، اس کے بدلے مفت خوری کا مرض بڑھتا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ اگر Reservations ہونا بھی ہے تو مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ـــــ کہیں مومن وانصار کی بات آجاتی ہے کہیں قریش کی بھی بات آجاتی ہے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ سارے قریش کو بیک ورڈ میں کیوں گنا جاتا ہے اور سارے مومن وانصار Second generation مومن وانصار جو کافی پرتکلف زندگی گذار رہے ہیں اور ان کے سارے بچے اچھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کو کیوں ریزرویشن مل جائے۔ تو میں یہ ضرور کہوں گا اگر ریزرویشن ملنا ہی ہے تو مذہب کی بنیاد پر نہیں ملنی چاہیئے بلکہ معاشی اور سماجی کمزوری کی بنیاد پر۔ اور جب معاشی اور سماجی کمزوری کم ہو جائے تو اس پر سے ریزرویشن ہٹ جائے۔ ایسے میں IRDP جیسے پروگرام کو بہتر سمجھتا ہوں اگرچہ اس میں بھی خرابیاں ہیں۔ لیکن اس میں اچھائی یہ ہے کہ جو بھی غریب ہے یا غریبی ریکھا سے نیچے ہے اسکو اوپر اٹھانے کی بات کی جاتی ہے۔ چنانچہ IRDP کا جو پروگرام ہے وہ پچھتر ملین کا تھا، اس طرح اس کا نفاذ ساڑھے سات کروڑ لوگوں پر ہوتا ہے۔ یہ پروگرام بھی اچھی طرح نہیں چل رہا ہے لیکن اس کی لوجک بہت صحیح ہے۔ وہاں ہندو مسلمان، کرسچین یا سکھ کا سوال نہیں اٹھایا جاتا بلکہ جو بھی غریبی ریکھا کے نیچے ہوگا اسکو Identify کر کے اس کو On capital Subsidy access in sum. دینے کی کوشش ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ ایسے بہت سے پروگرام ہیں لیکن یہ جو پروگرام ہیں مذہب کے نام پر چلتے ہیں، اور کہیں Backwardness کے نام پر چلتے ہیں اور برابر چلتے رہتے ہیں، ان میں بڑے Rationalisation کی ضرورت ہے۔ اس سے Minorities کا بھی نقصان ہو رہا ہے۔ ان کو ان کے حقوق نہیں ملتے، اور اگر مل بھی جاتے ہیں تو وہ بانٹ جاتے ہیں جس سے قوم کی معیشت کا حوصلہ گھٹتا رہتا ہے۔

●●

نئے ہندوستان کا ''اکلاویا''

(۲)

ہرش مندر
مترجم: پروفیسر افتخار عالم خاں

(نوٹ:۔ ہرش مندر ایک آئی اے ایس افسر تھے۔ انہوں نے ۲۰۰۲ء میں گجرات فسادات کے بعد سول سروس سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اور جب ہی سے انسانی حقوق اور سماجی انصاف کے ایک سر گرم کارکن کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اُن کی چار سو صفحات پر مبنی حالیہ کتاب بعنوان Looking away کے چند صفحات کا ترجمہ اس مضمون کے بطور پیشِ خدمت ہے)۔

مساوی حقوق کے مطالعے کے سینٹر (Centre for Equity studies)(CES) کی رپورٹ میں واضح کیا گیا ہے کہ آج ابتدائی اسکولوں میں ملک کے صد فیصد بچوں کے داخل کئے جانے کے دعوے کئے جا رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہی ہے کہ ہزاروں بچے ایسے ہیں جو شاید گورنمنٹ کی نظروں میں کبھی آتے ہی نہیں ہیں۔ یونیسکو نے اپنی ۲۰۱۱ء کی رپورٹ میں کہا تھا کہ اس وقت تقریباً ساڑھے دس لاکھ بچے اسکولوں سے باہر تھے، بچوں کے ساتھ ہی تقریباً بیس لاکھ نسبتاً بڑی عمر کے لڑکے بھی اسکولوں کے باہر موجود تھے ساتھ ہی ''محرومی واخراج'' کی رپورٹ میں وہ وجوہات بیان کی گئی ہیں جن کی وجہ پالیسیاں اور قانون بنانے والے صاحب اقتدار لوگوں کو کیوں وہ بچے نظر نہیں آتے ہیں جو دن رات شہروں کی سڑکوں اور گلیوں میں ہماری نظروں کے سامنے موجود رہتے ہیں ان سب کے علاوہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ بچے ایسے بھی ہیں جو کھیتوں اور کھلیانوں میں، فیکٹریوں، دکانوں، ڈھابوں اور گھریلو نوکروں کے بطور ہماری نظروں سے چھپے رہتے ہیں۔ ہم آج ملک میں تقریباً ایک کروڑ منقولہ کامگار (Migrant Workers) دستکار اور مزدور موجود ہیں۔ ان کے سیکڑوں بچوں کا اپنے والدین کے ساتھ نقل مکانی کرنے کے سبب پڑھائی کے سلسلے کا نقصان ہوتا ہے بلکہ اکثر یہ سلسلہ قطعی منقطع ہو جاتا ہے۔ متنازعہ علاقوں میں عموماً بچوں کے تحفظ کی خاطر، یا پھر اس وجہ سے کہ سیکورٹی فورسیز رہائش کے واسطہ اسکولوں کی عمارتوں کے اپنے قبضہ میں لے لیتی ہیں، یا پھر متنازع حالات میں سر پرستوں کے مارے جانے کی وجہ سے، غرض بچے اسکولوں کی پڑھائی سے قطعی محروم ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو بچوں کو بھی لڑائی کی متصادم صفوں میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ طوائفوں کے بچوں یا کوڑھ اور ایڈس کے مریضوں کے بچوں کے ساتھ خانہ بدوش قبائل کے بچوں کے لئے تو

اسکولوں کے دروازے مکمل طور پر بند رہتے ہیں۔

پچھلے دس سالوں میں تعلیم کے سلسلے میں خاص طور پر خواندگی اور اسکولوں میں داخلوں کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ دلتوں قبائلیوں اور مسلمانوں کے بچوں میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ لیکن یہ سب آبادی کے اصل تناسب کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ اب بھی ہزاروں بچے ایسے ہیں جو کبھی اسکول کی صورت نہیں دیکھ پاتے ہیں، اور جو اسکول میں داخل ہو جاتے ہیں جیسا کہ رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے وہ ہمیشہ بے حرمتی اور مایوسی کا شکار رہتے ہیں بطور ایک انسان کے ہماری بہت سی کمیوں اور خامیوں میں سب سے بڑے اور ناشائستہ خامی ہمارا اپنے بچوں سے برتاؤ ہے۔ آج ہزاروں بے گھر اور بے سہارا بچے ہمارے آس پاس بھوکے پیاسے پھرتے نظر آتے ہیں جو عموماً نفرت، حقارت اور مار پیٹ کے شکار ہوتے رہتے ہیں۔ بڑی تعداد ایسے بچوں کی ہے جن سے محنت اور مزدوری کروائی جاتی ہے اور اسکول جانے کے بجائے ہم ان سے گھروں میں اپنی خدمت کرواتے ہیں۔ جو بچے اسکولوں میں داخل بھی ہو جاتے ہیں ان سے کلاسوں کے اندر ذات یا مذہب کے نام پر بے رخی اور بے عزتی کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارا یہ ''غیر مساوی'' ہندوستان اسی وقت بدل سکتا ہے جب کے ہمارے اسکولوں کے اندر ہمارے بچوں کے ساتھ برابری اور انسانیت کا سلوک روا رکھا جائے گا۔

دلت بچوں نے بتلایا تھا کہ اسکولوں میں کلاسوں کے اندر اور کھانا کھانے کے دوران ان کو علیحدہ بیٹھایا جاتا ہے۔ ان کے اساتذہ ان کو ذلت آمیز کام جیسے ٹوائلیٹ وغیرہ صاف کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ ان بچوں نے اپنے استادوں کے ان کی طرف ہتک آمیز رویہ کے ساتھ سخت سزائیں دینے کی بھی شکایت کی تھی۔

''ملک میں علیحدگی پسندی'' کی رپورٹ میں یہ بات بھی واضح طور پر نکل کر آتی ہے کہ نچلی ذات اور بنجارہ قبائل کے بچوں کے سلسلے میں استادوں میں یہ سوچ عام ہے کہ ان بچوں کو پڑھنے اور اچھے نمبر لانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے کیونکہ گورنمنٹ نے ان کے لیے پہلے سے کالجوں، یونیورسٹیوں اور نوکریوں میں جگہ محفوظ کر رکھی ہے۔ نچلی ذاتوں کے طالب علموں کے بارے میں اس طرح کے خیالات ظاہر کر کے ان کے خیال سے وہ لوگ زندگی میں اپنی ذات کے روایتی پیشوں کو اختیار کر کے ہی ترقی کر سکتے ہیں۔ دراصل وہ ذات پات کے بعد بھید بھاؤ کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ استادوں کے ذہن میں مسلمان بچوں کی ایک روایتی اور دقیانوسی تصویر ہوتی ہے اور ان کا خیال ہوتا ہے کہ آئندہ وہ تشدد اور دہشت گردی کی طرف مائل ہوں گے، اس لئے ان کی پڑھائی لکھائی پر کوئی توجہ دینا فضول ہے۔ اسی طرح کا رویہ معذور طلبہ کے ساتھ بھی روا رکھا جاتا ہے۔ ان کے لئے کوئی مخصوص انتظام کرنا یا ان کے واسطے مخصوص ٹریننگ کے حامل اساتذہ فراہم کرنا یا ان کو استادوں کے ذریعے علیحدہ سے کچھ وقت دینے کی تدبیر کرنا وغیرہ کو بالکل فضول سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کو گورنمنٹ پر خرچ کا مزید بوجھ بڑھانے کے مصداق سمجھا جاتا ہے۔ اسکول اور کالجوں میں پرنسپل اور اساتذہ اکثر شکایت کرتے رہتے ہیں کہ معذور طلبا کی وجہ سے دوسرے طلبا کے لئے جگہ اور دوسری سہولیات کم ہو جاتی ہیں ''مساوی انصاف کے مطالعہ کے

مرکز'' (CES) کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ کلاسوں کے اندر سماج کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے طلبا کی موجودگی جو بذات خود تعلیم کا ایک اہم اور بیش قیمت ذریعہ ہوتی ہے، اس کو ان کے اساتذہ اپنے وقت اور توانائی کے زیاں کے ساتھ پیسے اور وقت کی بربادی تصور کرتے ہیں۔ اور بچے جو دن کا زیادہ حصہ اسکولوں میں گزارتے ہیں استادوں کے تفریقی برتاؤ، بے رخی اور تعصب سے نفسیاتی طور پر ڈر اور خوف کا شکار ہوکر اسکولوں سے غیر حاضر رہنے لگتے ہیں یا پھر پڑھائی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اسکول ان کے لیے تعلیم وتربیت کی جگہ ہونے کے بجائے ڈر وخوف کی ایک ایسی آماجگاہ بن جاتا ہے جہاں ان کا، ان کی ذات، مذہب، جنس وغیرہ کی پہچان کی وجہ سے مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اکثر یہ تعصبات نفسیاتی طور پر بچے کے ذہن پر اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ خود کو بھی موردالزام ٹھہراتے ہوئے آئندہ کسی بھی قسم کی برابری اور مساوات کی خواہش سے دست بردار ہو جاتے ہیں اس طرح اس مساوی حقوق کے دروازے مکمل طور پر بند ہو جاتے ہیں۔ صرف یہ احساس کہ اس کے لئے زندگی میں مواقع کم ہیں اس کے لیے زندگی میں کچھ حاصل کرنے کی ساری خواہشوں اور کوششوں کو کچل دیتا ہے اور نتیجتاً وہ اپنے حاشیہ پر رہنے والے والدین کے ساتھ جوڑ جاتا ہے جو اپنی روزی روٹی کمانے کی جدوجہد میں اس کی تعلیم کا بوجھ اٹھانے سے اکثر محروم ہو جاتے تھے۔

۲۰۱۳ء میں ناگ راج منڈے کی مراٹھی فلم 'فاندری'' آئی تھی۔ فاندری کے معنی ہیں ''جنگلی سور''۔ میرا قوی خیال ہے کہ اس فلم کا ہر اسکول اور کالج میں دکھلانا لازمی قرار کر دینا چاہیے۔ کسی دوسری فلم میں اس اذیت کو جو آج کے ہندوستان میں کسی نچلی ذات میں پیدا ہونے کی وجہ سے برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اس فلم میں نہایت دل فگار انداز میں دکھلائی گئی ہے ایک پندرہ سولہ سال کا لڑکا ''جابیا'' جو ایک ایسے دلت خاندان سے تعلق رکھتا تھا جن کا پشتینی پیشہ جنگلی سور پکڑنا تھا۔ جابیا کو اپنے کلاس کی ایک لڑکی اچھی لگنے لگی تھی، وہ ایک اونچی ذات کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی لیکن جابیا کی چاہت کا راز کسی اور کو معلوم نہ تھا جب وہ کلاس میں بیٹھی ہوتی یا گاؤں کے دھول بھرے راستہ پر جاتی ہوتی تو وہ اسے خاموشی سے دیکھا کرتا تھا۔ اور وہ بھی اس سے بدظن نہیں تھی، لیکن ایک نچلی ذات کا ہونے کی وجہ سے شاید اس کے لیے اس کے ذہن میں اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ لیکن جابیا کو قوی امید تھی کہ ایک دن وہ ضرور اس کی طرف راغب ہوگی۔ وہ ہمیشہ اس کے خیال میں مگن رہتا تھا لیکن اس کا یہ خواب اس روز چکنا چور ہو گیا تھا جب اس کو مجبوراً اپنے ماں باپ کی سور پکڑنے میں مدد کرنا پڑی تھی اس روز اس نے دیکھا تھا کہ اس کے کلاس کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ اس غلیظ کام کو کرنے کے لیے اس کا مذاق اڑانے میں وہ بھی شامل تھی۔ اس روز اس پر اس نہایت تکلیف دہ حقیقت کا انکشاف ہوا تھا کہ گو ملک میں ہم کو دوسرے طلبا کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کا حق دے دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود ذات پات کے بھید بھاؤ کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ وہ صرف اپنی پیدائش کے اتفاقیہ حادثہ کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے دوسروں سے مختلف علیحدہ اور تنہا کر دیا گیا ہے۔

مکان کا فلسفیانہ مطالعہ

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

فلسفی، مفکر اور طبیب حسن بن حسن ہیثم نے حیات و کائنات کے عناصر پر غور و فکر کیا ہے اور اپنی اعلیٰ دماغی کاوش سے ہمارے ذہن کو روشن کیا ہے۔ اس عظیم مفکر نے ''مکان'' کے بارے میں عالمانہ افکار پیش کئے ہیں۔ ''مکان'' اردو میں تو گھر کو کہتے ہیں مگر اردو میں زمان و مکان کا تصور بھی ہے۔ مکان کی ماہیت کے بارے میں اہل نظر متقدمین کے نظریات میں بڑے اختلافات ہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ جسم کا مکان وہ ہے جو جسم کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ بعضوں نے کہا کہ جسم کا مکان وہ خلا ہے جس کو جسم پُر کئے ہوئے ہے۔ متقدمین میں سے کسی نے مکان کی ماہیت کے بارے میں کوئی حتمی نظریہ پیش نہیں کیا ہے۔ اس پس منظر میں یہ بحث پیش کی گئی تا کہ مکان کی ماہیت کا مطالعہ عمق کے ساتھ کیا جا سکے۔ اس کی حقیقت کو اجاگر کیا جا سکے اور اس بارے میں اشتباہ زائل ہو جائے۔ اس لئے ابن ہیثم نے یہ رسالہ ''مکان'' پر قلم بند کیا ہے۔

ابن ہیثم فرماتے ہیں کہ مکان ایک مشترک اسم ہے جس میں بہت سے عناصر شامل ہیں اور یہ سارے عناصر ''مکان'' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ سائل کو جواب دیتے وقت جسم کے مکان کا نام لیا جاتا ہے۔ سائل کے جواب دینے میں تمام عناصر و اشیاء اس اسم مکان میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی سائل پوچھے کہ لوگوں میں فلاں کون انسان ہے؟ اور کہاں ہے؟ اس کہاں ہے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ فلاں بھی مکان ہے جہاں وہ شخص موجود ہے یا کوئی پوچھے کہ فلاں شخص کہاں رہتا ہے؟ اس کو جواب دیا جائے گا کہ وہ فلاں محلّہ میں رہتا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ محلّہ اس شہر کا جز ہے جس میں وہ شخص رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے گھر میں موجود ہے اور اس کے بارے میں سوال کیا جائے کہ وہ کہاں ہے؟ تو جواب دیا جائے گا کہ وہ فلاں کی مجلس میں ہے یا فلاں کے گھر میں ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مجلس ہی مکان ہے اور وہ گھر بھی مکان ہے جس میں مجلس ہے۔ سوال کسی انسان کے بارے میں ہو یا کسی غیر انسان کے بارے میں ہو مگر وہ ہو گا ایک ہی مکان پر۔ اس بارے میں اختلافات ہیں یعنی اگر آپ کسی جسم کو دور کرنا چاہتے ہیں مگر آپ اس مکان کو نہیں دور کرنا چاہتے جس مکان میں جسم موجود ہے۔ مصنف ابن ہیثم فرماتے ہیں یہی یہ وہ نکتہ ہے جس سے ہم بحث کرنا چاہتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالی نے جسم کے لئے دو چیزیں بنائی ہیں۔ان دونوں چیزوں پر مکان کا اطلاق ممکن ہے۔پہلی چیز وہ سطح ہے جو جسم کو گھیرے ہوئے ہے وہ جسم جو ہوا میں ہے یعنی وہ ہوا جو جسم کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔یعنی جسم کی فضا۔دوسرا عنصر وہ ہے جو جسم پانی کے اندر ہو اور پانی اس جسم کا احاطہ کئے ہوئے ہو۔ہر جسم کی داخلی سطح ایک جسم ہے جو منفصل ہے اس سے اسی بنا پر ایک گروہ نے اختلاف کیا ہے اور جسم کو خلاء متخیلہ سمجھا ہے جس نے جسم کو گھیر رکھا ہے۔اس لئے ہر جسم کہیں سے منتقل ہو کر وہاں آیا ہے جہاں وہ اس وقت موجود ہے۔پس سطح محیط کو خالی تصور کیا جاسکتا ہے جس میں جسم نہ ہو جس میں ہوا یا پانی جاتی ہو جو اس کو گھیرے ہو یا وہ جسم ہو جو جسم کے علاوہ ہو غیر جسم ہو۔دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان معانی کو یا شکلوں کو بھی مکان کہا جاسکتا ہے۔یعنی ہر شکل کو مکان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

جب شکل میں تغیر پیدا ہوگا تو وہ سطح بھی بدل جائے گی جو سطح شکل کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔دوران بحث ابن ہیثم نے بتایا کہ مشک میں پانی بھرا ہوا ہے یہ ایک جسم ہے اب اگر ہم اس کے پانی کو نکالتے جائیں تو جسم چھوٹا ہوتا چلا جائے گا اور مکان بھی چھوٹا ہو جائے گا۔

جب کوئی جسم تبدیل ہوگا تو اس کا احاطہ کرنے والی سطح بھی تبدیل ہوگی۔بعض شکل ایسی ہوتی ہے کہ سطح کی پیمائش تو بڑھ جاتی ہے مگر جسم کی مساحت میں کوئی فرق نہیں آتا۔مثلاً کوئی جسم ایسا ہو کہ اس کی دو سطحیں متوازی ہوں۔پر ایسے متوازی سطحوں والے جسم کو تقسیم کر دیا جائے اور دو ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے تو اس جسم کی ابتدائی سطح سے یہ جوڑی ہوئی شکل بڑھ جائے گی سطحیں تقسیم ہونے کے بعد تعداد میں زیادہ ہو جائیں گی۔سطح کے بڑھنے سے مکان بھی بڑھ جائے گا۔یعنی وہ سطح بڑھ جائے گی۔اصل جسم میں کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک جسم بڑھا ہے مگر اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے اس کی مثال مشک کی ہے اگر مشک سے بار بار پانی خارج کیا جائے تو اندرونی حصہ میں جو پانی باقی رہے گا وہی سطح رہے گی اس پانی کا مکان وہی رہے گا۔جتنی مرتبہ بھی پانی خارج کیا جائے تو باقی رہنے والے پانی کا مکان مشک کی اندرونی سطح رہے گا اس صورت میں تناقض یہ پیدا ہوگا کہ جسم کی کمیت تو کم ہوتی جائے گی لیکن اس کے مکان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مشک کی اندورنی سطح جو ہر حال میں غیر متغیر ہے وہ مختلف کم ہو جانے والے پانی کا مکان بن جاتی ہے یعنی جسم کی کمیت کم ہو جاتی ہے مگر مکان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔پس اندورنی سطح مشک کے جسم کا مکان ہے۔اصلاً اس میں شنیع تناقض ہے۔

اسی طرح دوسری مثال گڈھے کی ہے مثلاً کوئی ہموار سطح ہو ٹھوس ہو اس میں کروی یا اسطوانی یا مخروطی شکل کا گڈھا بنایا جائے۔یہ گڈھا جو بنے گا اس کو کھودنے سے نئی شکل بن جائے گی اور اس کا پہلے والا جسم کی کمیت میں کم ہو جائے گا۔مٹی نکل جانے سے گڈھے کی کمیت میں کمی واقع ہوگی مگر گڑھے کا جسم وہی رہے گا اگر گڈھے کے جسم کی سطح

بڑھائی جائے تو اس گڈھے کے جسم کا مکان پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہو جائے گا۔ یہ قول فاسد ہوگا۔اس سے لازم آتا ہے کہ ایک ہی جسم کے متعدد مکان ہو سکتے ہیں جس کی کمیت مختلف حالات میں مختلف ہوگی۔خواہ جسم کی کمیت میں کوئی تغیر واقع ہو یا نہ ہو۔ایسا کوئی جسم بیرونی اثر قبول کرنے والا بھی ہو سکتا ہے مثلاً موم، قلعی اور پانی خاص کر سیال جسم مقدار میں کسی تبدیلی کے بغیر اپنی اشکال تبدیل کرتے ہیں مثلاً موم سے بننے والے جسم کے ٹکڑے۔اس کا احاطہ کرنے والی سطحیں اس کا مکان کہلائیں گی۔اب اگر اس ٹکڑے کو کروی شکل دیدی جائے تو اس کا مکان اس کی کروی سطح کے مطابق ہوگا جو اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔اگر ایک مکعب جسم کو کروی شکل دے دی جائے گی تو کروی شکل مکعب کے مقابلہ میں کم ہو جائے گی۔

گر یہ کہا جائے کہ کسی جسم کا مکان اس کو محیط کرنے والی سطح کا نام ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ کسی جسم کے مکان سے مراد مختلف مقدار کے مکان ہوتے ہیں اور ان کی اتنی صورتیں ممکن ہیں جن کی کوئی تحدید نہیں ہو سکتی اور ان میں کوئی مکان دوسرے مکان کے مقابلہ میں قابل ترجیح نہیں ہو سکتا۔اور ان متعدد صورتوں میں کسی کو بھی اس جسم کا مکان قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی جسم کو احاطہ کرنے والا خط اس کا مکان ہوتا ہے اور اگر ایسا کہا جائے تو مجازاً ہوگا نہ کہ حقیقتاً۔اس طرح جیسے گھر، محلہ اور کسی شہر کو محاورتاً مکان کہا جائے۔

مکان کی دوسری تعریف پر اعتراض:

مکان کے متعلق یہ کہنا کہ مکان وہ فرضی خلاء ہے جس کو کوئی جسم پر کرتا ہے تو اس پر یہ شبہ وارد ہوتا ہے کہ خلاء تو غیر موجود ہے چنانچہ اگر خلاء کو کسی جسم کا مکان کہا جائے تو یہ الزام آئے گا کہ مکان موجود ہی نہ ہو۔حالانکہ جسم تو موجود ہے کیوں کہ جب بھی کوئی جسم موجود ہے تو ضروری ہے کہ وہ کسی مکان میں ہو اس لئے جسم کا وجود خود مکان کا وجود ثابت کرتا ہے۔اور یہ صورت ظاہر کرتی ہے کہ خلاء کا وجود ہے اور یہ بات ان لوگوں کے لئے بہت کمزور ہے جو خلاء کو غیر موجود مانتے ہیں لیکن یہ شبہ مندرجہ ذیل دلائل سے دور کیا جا سکتا ہے کہ خلاء میں مراد حدود ہیں جو مادے سے مجرد ہوں جب فرضی خلاء کو مکان قرار دیا جائے تو مکان سے مراد وہ فرضی حدود ہے جو جسم کے حدود کے برابر ہے جن کو جسم پر کرتا ہے یہ حدود کے برابر ہے۔یہ فرضی حدود جسم کے حدود کے مساوی ہے اور یہ فرضی حدود ایک ایسا خط ہے جو طول میں ہے عرض میں نہیں ہے۔ خلاء اور جسم دونوں عرض سے خالی ہیں اس لئے دونوں ایک ہی جسم ہے۔خلاء اور جسم دونوں کے حدود ایک ہیں جو ابعاد کہلاتے ہیں اس طرح فرضی ابعاد جسم سے مجرد ہو کر نہیں ہو سکتے۔

اس کی مثال برتن سے دی جا سکتی ہے۔اس طرح کسی برتن کے اندرونی ابعاد غیر تغیر پذیر ہوں گے اگر اس برتن میں ہوا موجود ہو پھر اس کو پانی سے بھر دیا جائے تو بھی برتن کے اندر (حدود) ابعاد وہی ہوں گے جو پہلے تھے یا

پانی کو انڈیل کر اس برتن میں دوسرا کوئی سیادل مادہ بھر دیا جائے تو اندرونی ابعاد وہی رہے گا۔ جب نئی چیز آئے گی تو وہ برتن کے حدود سے منطبق ہو جائے گی دونوں متحد ہو جائیں گی۔ ان کی کمیت میں فرق نہیں آتا۔ مثلاً ایک گلاس میں پانی ڈالا جائے تو ہر بار پانی ڈالنے سے پانی کی شکل گلاس کی مناسبت سے یکساں ہوگی۔ پانی کو ایک جیسی شکل دینے کا سبب گلاس کی اندرونی شکل ہوگی یہ اندرونی شکل گلاس کے اندرونی حدود ہوں گی۔ اس سے ثابت ہوا کہ گلاس کے اندر ابعاد ہر چیز سے منطبق ہو جاتے ہیں جو اس میں ڈالی جائے۔ یہ ابعاد غیر متغیر پذیر ہے۔ اسی طرح انہوں نے گلاس کی مثال دی اور بتایا کہ جو چیز اندر ہے وہ دوسرا جسم ہے جس کے اندر کا حصہ اوپر کے حصہ سے بالکل مختلف ہے۔ مثلاً گلاس میں پانی ہے تو پانی کی اندرونی سطح سے اس کے جسم کا تعین ہوگا۔ پھر اس نے بتایا کہ ایک جسم دوسرے جسم کو برداشت نہیں کرتا۔

آخر میں وہ کہتا ہے اگر سوال کیا جائے کہ خلاء ہی جسم ہے اور وہی جسم مکان میں متمکن ہے؟ اور کیا یہ جائز نہیں کہ ایک جسم میں دوسرا جسم داخل ہو جائے اور وہ ایک جسم ہو جائے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ ایک جسم دوسرے جسم میں داخل نہیں ہو سکتا اگر وہ جسم مادہ والا ہے وہ مادہ مانع ہے دوسرے جسم کے انضمام سے۔ خلاء مادہ والا نہیں اور دفع کرنے والا ہے خلاء جسم کو قبول کرتا ہے۔ اس قول سے یہ نظریہ باطل ہو جاتا ہے کہ جسم طبعی دو جسم ہیں اس لئے وہ خلاء میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اس پوری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جسم جب تخیل میں مجرد شکل میں دیکھا جائے تو وہ خلاء رہ جاتا ہے بغیر مادہ کے۔ وہ مساوی ہے جسم کے وہ شبیہ شکل ہے جسم کی۔

(یہ پورا مقالہ رسائل ہیثم سے مرتب کیا گیا ہے۔ رسائل ہیثم کا ترجمہ پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ ابن سینا اکیڈمی میں موجود ہے۔ یہ مقالہ اسی ترجمہ سے اخذ و التقاط پر مبنی ہے)

مدرسۃ العلوم کے لیے مقام کے انتخاب کے بارے میں سرسید کی رائے طلبی اور مولانا حالی کا اظہارِ خیال

پیشکش: ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

سرسید نے ایم اے او کالج کے لئے علی گڑھ کا انتخاب کرنے سے پہلے اپنی گزٹ میں لوگوں سے رائے بھی لی۔ گزٹ کے سوال پر جو جواب آئے ان میں ہمیں وقار الملک کی تحریر گزٹ میں چھپی مل گئی تھی، جسے ہم نے اپنے متعلقہ مضمون میں نقل کر دیا تھا۔ اب ایک اور سوغات مل گئی۔ یہ حالی کا ایک مکتوب ہے،

صحیفہ (مجلس ترقی ادب، لاہور) کا حالی نمبر جو حالی کے صد سالہ جشن پیدائش کی مناسبت سے شائع ہوا، جنوری - جون ۲۰۱۵ء کی اشاعت ہے۔ اس میں مشہور محقق افضل حق قرشی صاحب کی عنایت سے حالی کا ایک خط شائع ہوا ہے۔ جو ہم ان کے شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ یہ ہمارے مذکورہ قبلاً پیش کردہ دستاویز پر ایک اضافہ ہوا:

مندرجہ ذیل خط ایڈیٹر اخبار سین ٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کے نام ہے۔ مدرسۃ العلوم کے قیام سے پہلے اس بات پر بحث وتمحیص ہو رہی تھی کہ مدرسہ کہاں قائم کیا جائے۔ بہت سے لوگوں نے اس پر اظہارِ خیال اور اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ خواجہ حالی نے اپنی رائے کا اظہار مندرجہ ذیل خط میں کیا۔ اس خط پر دو اور صاحبان خواجہ ضیاء الدین دہلوی اور جناب سبحان بخش شکار پوری کے دستخط بھی ہیں جو خواجہ حالی کی رائے سے متفق تھے۔ اس خط کی نقل محترمہ مسرت طاہرہ کو شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کی لائبریری سے ملی تھی جسے انھوں نے اپنے ایم۔اے اردو کے مقالے ''حالی کی مکتوب نگاری'' کے ضمیمہ الف میں نقل کیا ہے۔

میرے مخدوم ومکرم ایڈیٹر [اخبار] سائن ٹیفک سوسٹی علی گڑھ۔

سلامت

میری رائے جو ذیل میں درج ہے اور جس میں میرے ساتھ جناب مولوی خواجہ ضیاء الدین صاحب دہلوی اور جناب سبحان بخش صاحب شکار پوری متفق ہیں۔ از راہ عنایت وکرم اپنے اخبار میں درج فرما کر ہم سب کو مرہونِ منت فرمایئے۔ والتسلیم والتسنیم۔

میں کئی دن سے ارادہ کررہا تھا کہ شمال ومشرق کے شہروں میں سے جس شہر میں مدرسۃ العلوم کا قائم کرنا میرے نزدیک مصلحت ہے، اس کی اولیت کی وجوہ لکھ کر کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم اہل اسلام کی خدمت میں پیش کروں مگر سین ٹیفک سوسٹی علی گڑھ کے اخبار مورخہ ۲۶ جولائی کو دیکھ کر مجھ کو سبکدوشی حاصل ہوگئی۔ اب مجھ کو اس سے زیادہ لکھنے کی حاجت نہ رہی کہ جناب ایڈیٹر صاحب اور جناب مولوی مشتاق حسین صاحب نے اس باب میں جن وجوہ سے علی گڑھ کو اور شہروں پر ترجیح دی ہے، ان میں سے اکثر ایسی کافی ہیں جن پر غور کرنے کے بعد اور کسی وجہ کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ خصوصاً یہ وجہ کہ اس مدرسہ سے زیادہ تر ان لوگوں کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے جو علوم قدیم پر مٹے ہوئے ہیں اور علوم جدیدہ اور مغربی زبانوں سے ایسے بدکتے ہیں جیسے دیہات کے ڈھور ڈنگر اجلے کپڑوں والوں سے بدکتے ہیں۔ پس جو تدبیریں ان کی ترغیب اور تسخیر کے لیے کی گئی ہیں ان ہی میں سے ایک بڑی تدبیر یہ بھی ہے کہ یہ مدرسہ جہاں تک ہوسکے ان شہروں اور قصبوں کے قرب میں قائم کیا جائے جہاں علوم قدیمہ کا رواج قدیم سے چلا آتا ہے اور علوم جدیدہ کا پرچھانواں تک ان پر نہیں پڑا۔ میرے نزدیک اس قسم کی بستیاں یا تو لکھنؤ کے مضافات میں پائی جاتی ہیں جیسے خیر آباد، گوپا، منئو، کاکوری، سندیلہ، سہال، بانسہ وغیرہ یا دلی یا رام پور کے قرب وجوار میں پائی جاتی ہیں جیسے سہارن پور، کاندھلہ، دیوبند، امیٹھ، پانی پت، سونی پت، فرید آباد، خواجہ، شکار پور، مراد آباد، امروہہ، بدایون، سہسوان وغیرہ لیکن اگر لکھنؤ اور مضافاتِ لکھنؤ کا لحاظ کیا جائے تو شمال مغرب کے شہروں میں اس کام کے لیے کان پور کے سوا کوئی جگہ خیال میں نہیں آتی اور کان پور فی حد ذاتہٖ ہرگز اس بات کی قابلیت نہیں رکھتا کہ یہ مدرسہ وہاں قائم کیا جائے۔ قطع نظر اس کے کہ جو وجوہ علی گڑھ کی ترجیح کے لیے بیان کی گئی ہیں ان میں اکثر کان پور کے ساتھ مساعدت نہیں کرتیں اور بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو کان پور پر ہرگز نظر جمنے نہیں دیتیں۔ مگر چوں کہ ہم کو اُمید نہیں ہے کہ کان پور پر اس قدر رائیں متفق ہوں جن کا مقابلہ کرنا ضرور ہو، اس لیے ہم ان کے بیان کرنے کی کچھ حاجت نہیں رکھتے۔ پس دہلی اور رام پور کے قرب کا لحاظ کرنا واجب ٹھہرا۔ اس غرض

کے لیے شہر کی آب و ہوا پر لحاظ کرنا بھی ایک نہایت ضروری امر ہے۔ خصوصاً ہم لوگوں کی نظر میں کہ آج کل ہیضہ اور بخار کے موسم میں وارد لاہور ہیں۔ مجھ کو کبھی علی گڑھ میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا مگر بلند شہر کے ضلع میں جتنی مشہور بستیاں ہیں ان سب کی آب و ہوا کو میں بسبب اپنی واقفیت کے اپنے تمام دیکھے ہوئے شہروں کی آب و ہوا سے بہتر جانتا ہوں اور علی گڑھ بھی بہ سبب قرب کے آب ہوا کے اعتبار سے ضلع بلند شہر ہی کے حکم میں ہے۔ اس کے سوا وہاں کی آب و ہوا کی تعریف میں نے ایسے لوگوں سے بھی سنی ہے جن کا قول ایسے امور میں نہایت معتبر گنا جاتا ہے۔ دلی اور آگرہ جو ہندوستان کے مشہور و ممتاز شہر ہیں اور جن کے دیکھنے کو لوگ دُور دُور سے آتے ہیں اور علی گڑھ کا ان دونوں کے بیچ میں ہونا اور دونوں سے قریب تر ہونا یہ ایک دام ہے جو کہ نو عمر اور زندہ دل لڑکوں کو دُور دُور سے کھینچ کر اس امید پر لے آئے گا کہ آہا ہم تعطیل میں آگرہ اور دلی کی خوب سیر کریں گے اور یہ بات نہ دلی میں حاصل ہو سکتی ہے اور نہ آگرہ میں۔ آگرہ بھی ایک ایسا شہر ہے جس پر اس کام کے لیے بے شک نگاہ پڑتی ہے مگر آب و ہوا کی خوبی اور دلی، رام پور کا قرب اور تمام ٹرینوں کا مرکز ہونا علی گڑھ کو اس پر بھی ترجیح دیتا ہے۔ الٰہ آباد کا دلی وغیرہ سے دُور ہونا اور وہاں کی آب و ہوا کا اچھا نہ ہونا اس کے سوا، اس کی مرجوعیت کی ایک وہ وجہ ہے جس کو شاید بعضے صاحب اس کی ترجیح کے بیان میں پیش کریں گے یعنی گورنمنٹ اور ہائی کورٹ اور صدر بورڈ وغیرہ۔ بڑے بڑے محکموں کا اس شہر میں ہونا اگرچہ بادی النظر میں اس کے رجحان پر دلالت کرتا ہے مگر غور کرنے کے بعد بالکل اس کے برخلاف گواہی دیتا ہے۔ کیوں کہ ایسے صدر مقامات میں متوسط درجہ کی لیاقت والوں کے بھی معاش اور نوکری کی سبیلیں اکثر نکلتی رہتی ہیں اور ظاہر ہے کہ مدرسۃ العلوم کے طالب علم بے دستگاہ اور پردیسی اور جویائے معاش بہت سے ہوں گے۔ پس الٰہ آباد کی حالت موجودہ اکثر طالب علموں کی ترقی اور روز افزوں میں خلل انداز ہوگی اور پہلے اس سے کہ وہ ہاتھ پیر مار کر ساحلِ مقصود تک پہنچیں غالباً یہ لالچ اُن کو بیچ ہی میں لے بیٹھے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم سب کے نزدیک مدرسۃ العلوم کے علی گڑھ میں قائم کرنا عین مصلحت ہے۔

راقم الطاف حسین حالی

عابداللہ غازی کی کتاب

جہدِ مسلسل، علی گڑھ سے علی گڑھ تک، ۱۹۵۱ء-۱۹۵۹ء

کچھ عابداللہ غازی، کچھ پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی کے قلم سے

عابداللہ غازی کی کتاب پر پچھلے دنوں فکرنو میں ایک تبصرہ ہوا، اس کتاب کے مطالعہ کے دوران ریاض صاحب نے متعدد مقامات نشان زد کردیے جن سے ان کی پسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور۔ متعدد جگہ پر کچھ نوٹ بھی لکھ دیے، جن میں کوئی ایسا نکتہ سامنے آجائے جو قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوسکے، یہ سب اصل، اور ریاض صاحب کے Comment ملاحظہ فرمائیں۔ (ضمناً عابداللہ غازی کی دلآویز تحریروں کے کچھ نمونے بھی مل جائیں گے)۔ (ادارہ)

کتاب کا آغاز ایک تصویر سے ہوتا ہے، جس میں ڈاکٹر راجندر پرشاد کرسی پر بیٹھے ہیں، اور عابداللہ غازی ان کے برابر کھڑے ہوئے شاید کچھ بول رہے ہیں، دس پندرہ حاضرین بھی اس تصویر میں موجود ہیں، تصویر پر لکھا ہے ''صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرساد کی علی گڑھ آمد پر عابداللہ غازی طلبہ کی یونین کے صدر کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے''۔

یہ غلط ھے. جب راجندر بابو علی گڑھ آئے تھے اس وقت غازی علی گڑھ میں نہیں تھے. (آگے کے بقیہ دو لفظ پڑھنے میں نہیں آئے) (ر.ش)

ریاض صاحب زبانی توضیح یہ تھی کہ راجند بابو ۵۰/۱۹۵۱ء میں آئے، عابد اللہ غازی کا یونین کا زمانہ بہت بعد میں شروع ہوا، ایسا معلوم ہوتا ھے کہ یہ تصویر کسی اور موقع کی رہی ہوگی، جسے یادداشت کے سہو نے علی گڑھ سمجھا۔

- پھر نہ قوم کو سرسید جیسا محبِّ قوم دوراندیش ودانشور ملا، نہ مسلم یونیورسٹی جیسا ادارہ بن سکا، ان کے بعد جو لوگ آئے انھوں نے صرف سیاست کو سوچا۔ متحد کرنے کے بجائے تقسیم کی باتیں کیں، ملانے کے بجائے جدا کیا، مرض کے علاج کے بجائے بے یقینی کی وبا پھیلادی۔ اتحاد کے بجائے انتشار کے نقیب بن گئے اور اس درسگاہ کو جس نے انھیں زندہ رہنے کے مواقع دیئے بوڑھی ماں کی طرح غیروں کے نرغے میں چھوڑ کر رخصت ہوگئے۔ (ص ۳۲)
- میں اپنے کیمپ میں تنہا تھا اور شاید اب تک تنہا ہوں۔ (ص ۳۵)
- ہم ہر بات کو اسلام پر ختم کرتے ہیں اور ایسا کرنے میں ہم میں سے وہ آگے آگے رہے ہیں جو عقیدتاً، تہذیباً، لساناً اسلام سے دور تھے۔ ہم نے بچپن میں نعرہ سنا تھا ''پاکستان کا مطلب کیا ہے! لاالہ الا اللہ''۔ لیکن ان نعروں کو ''لاالہ الا اللہ'' کے لفظی معنی سے بھی واقفیت نہیں تھی۔ نہ ان کو، نہ نعرہ لگوانے والے قائدین کو۔ (ص ۳۵)

● ہمارے علماء کی تربیت تقریر کی حد تک ہے، تعمیر کا اس میں حصہ نہیں۔ اس میں دوسروں کے لیے ترہیب ہے، اپنے لیے ترغیب نہیں۔ مدارس اسلامیہ ہوں یا انگریزی اسکول یا مسلم یونیورسٹی، کہیں بھی نہ خدمت خلق کی تربیت ہے، نہ اس کی ترغیب۔ مغربی دنیا کے ہر ادارے میں عملی تجربات اور سلیقۂ خدمت کا اہتمام ہے۔ (ص ۴۲)

● رامپور سے جماعت اسلامی کی ثانوی درسگاہ کے طلبا نجات اللہ صدیقی، عبدالحق انصاری، عرفان احمد خان، اشتیاق احمد دینی تعلیمی نصاب کو ختم کر کے واپس آئے۔ یہ لوگ فکری انقلاب تو نہیں لائے لیکن اسلامی فکر کی کچھ لہریں ضرور بیدار کیں جوان لوگوں کے سعودی عربیہ اور امریکہ، آسٹریلیا جانے کے بعد بحر عرب کے ڈالر کی موجوں میں ڈوب گئیں۔ بیرون ہند میں رہ کر انھوں نے دنیا کے حسنات جمع کر کے انھیں آخرت کے لیے امریکہ برطانیہ کے بینکوں میں جمع کرا دیا۔ (ص ۴۷)۔

● میرے ان کا مرڈ سے اس کے بعد تعلقات کچھ کشیدہ رہے اور وہ اس کے بعد امریکہ آ کر شاد آباد ہیں۔ (ص ۵۳)۔

● احمد سعید صدارت کے امیدوار تھے اور ان کا حقیقی معنی میں کوئی حریف نہ تھا۔ ان کی مقبولیت علی گڑھ میں ذاکر صاحب کے تعلیمی مقاصد کو چیلنج کر رہی تھی (ص ۶۳)۔

یونین پلیٹ فارم ایسی تجربہ گاہ تھا جس کے صحیح استعمال سے قوم پر ہندستانی جمہوریت مؤثر شرکت کے دروازے کھل سکتے تھے۔ لیکن افسوس ہے، یونین کے رہنماؤں نے ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں نہ کوئی مثبت کردار ادا کیا نہ جمہوریت کی آبیاری کی اور نہ کسی پائیدار کام کی بنیاد ڈالی۔ البتہ ایک بہت اہم اور مثبت کام علی گڑھ کے کھلنڈروں نے کراچی میں کر ڈالا جہاں ظلِ نظامی اور ذاکر علی خاں کی قیادت میں انھوں نے ہنستے کھیلتے ایک عظیم ادارہ رشک علی گڑھ سرسید یونیورسٹی قائم کر دی اور اس کے ساتھ متعدد ذیلی تعلیمی ادارے!۔ (ص ۶۴)

ذاکر صاحب، سیدین صاحب، مونس رضا صاحب (جیسے علی گڑھ کے فرزندوں کی موجودگی میں یہ مثبت کردار کو نظر انداز کرنا کہاں تک صحیح ہے)۔ (ر۔ش)

● یوں علی گڑھ کی زندگی ایک مسلسل قہقہہ تھی جو زندگی سے بھرپور تھا۔ (ص ۶۷)۔

● لیکن ذاکر صاحب کسی جوہر کو ضائع کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے۔ (ص ۸۰)۔

● ہماری نرم و گرم شخصیت اپنے مذاق سے جنگ کر رہی تھی اور علی گڑھ جو سہولتیں پیش کر رہا تھا ان کا ہم فائدہ نہیں اٹھا رہے تھے۔ (ص ۸۸)۔

● ۴۷ء کے زمانے میں ریاض الرحمٰن شیروانی، سعید اختر، شفیق انجم وغیرہ کے ساتھ نیشنلسٹ گروپ میں شامل تھے۔ (ص ۱۲۷)۔

شفیق انجم کا اس سنہ میں علی گڑھ میں پتہ بھی نہ تھا اور مجھے اس زمانے میں استاد اطہر کا بھی علی گڑھ میں ہونا یاد نہیں۔ (ر۔ش)

● میں خودتو یونین الیکشن میں کنڈیڈیٹ نہیں بن سکا، شفیع قریشی کی کنڈکٹری کی حیثیت سے ہم نے نمایاں رول ادا کیا۔ وہ الیکشن ہار گئے اور بلبلیا جیت گئے، اس طرح ایس ایف کے پریزیڈنٹ اور جماعت کے سکریٹری کا نیا محاذ یونین میں قائم ہوگیا۔ (ص ۱۳۰)

وہ علی گڑھ میں اکثر ہارتے ہی رہے۔ (ر.ش)۔

● ذاکر صاحب کا تاریخی جملہ: ”جو کام کرو دل لگا کر کرو، اگر وہ کام اس قابل ہے کہ کیا جاسکے تو اس قابل بھی ہے کہ اچھی طرح کیا جائے“۔ (ص ۱۳۶)۔

یہ جملہ ذاکر صاحب نے نہ معلوم کتنی بار کتنے موقعوں پر دوھرایا ہوگا۔ انھوں نے سرور صاحب کو مشورۃً کا حکم دیا تھا کہ وہ انگریزی سے اردو میں منتقل ہوجائیں۔ (ر.ش)

● اس لیے زوال حیدرآباد کی اصل کہانی پولس ایکشن نہیں بلکہ مجلس، اتحادالمسلمین کے رہنما قاسم رضوی اور حیدرآباد کے پرائم منسٹر لائق علی خان کی ناعاقبت اندیشی ہے۔ (۱۳۷)۔

لائق علی خاں نہیں بلکہ میر لائق علی خاں (ر.ش)

● ٹمو بھائی امتحان پاس کر کے لیکچرر بنے ریڈر اور پروفیسر رہے لیکن یونیورسٹی میں یہ بات زبان زد رہی کہ ان کے والد کا اثر اور ان کی اپنی تدابیر کا اس کامیابی میں کافی زیادہ دخل رہا۔ (ص ۱۳۹)

یہ ٹمو بھائی، آفتاب ہوسٹل میں ہمارے جونیر رہے تھے، اور ان کے والد صاحب (پرنسپل حبیب الرحمن صاحب، جو ٹریننگ کالج کے پرنسپل ہوئے) ہمارے پرووسٹ۔ لیکن ان سے ہماری کبھی بنی نہیں۔ (ر.ش)۔

● علی گڑھ میں چوتھے سال کا آغاز سیاسی ہلچل کے ساتھ ہوا۔ (سنہ ۱۹۵۴-۱۹۵۵)۔ (ص ۱۴۹)۔

● میری نگاہ میں علماء دیوبند اور جماعت اسلامی کا اختلاف اصولی نہیں، فروعی تھا۔ لیکن دیوبند میں وہ اختلاف اصل الاصول تھا۔ (ص ۱۵۳)۔

یہ صحیح ہے کہ مولانا مودودی کی تحریریں اسلاف کرام کی عظمت کم کرتی تھیں اور اس کا سیاسی پہلو غیر عملی تھا۔ تاہم دار العلوم دیوبند سے جماعت کی مخالفت جس حد تک کی جاتی تھی وہ بھی درست نہ تھا۔ (ر.ش)

● قاری محمود حسین ریٹائرمنٹ کے بعد رجسٹرار ہوئے جو وائس چانسلر کے بعد یونیورسٹی کا اہم ترین عہدہ تھا۔ محمود صاحب اسے اس طرح نبھایا کہ وہ ذاکر صاحب پر چھاگئے۔ وہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ (ص ۱۷۵)۔

● اباجان (حامد الانصاری غازی) نے مدت سے خانگی مجبوریوں اور سسرال کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ (ص ۲۱۴)۔

غازی صاحب سے میری پہلی ملاقات مارچ ۱۹۴۷ء میں دھلی میں ھوئی تھی اور آخری ملاقات سری نگر مارچ ۱۹۸۳ء میں. جب سری نگر میں ملاقات ھوئی تو انھوں نے فرمایا تھا ھماری دوھری عید ھوگئی. غفر له. میں نے ان سے شعبۂ عربی میں دیوبند کی ادبی خدمات پرلیکچر بھی دلوایا تھا. (ر.ش)

● آج کا علی گڑھ نہ تو ماضی کا علی گڑھ ہے، نہ اس کے پاس شاید کوئی مستقبل کا خواب ہے، مسلمان کو مزاجاً ہنگامی سیاست چاہیے۔ پاکستان میں ہنگامہ ہی ہنگامہ ہے۔ اور علیگڑھ خموشی ہی خموشی ہے : ع ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا (۲۴۴)۔

بد قسمتی سے اب بھی یہاں ایسے لوگ بستے ھیں. ایسی کئی مثالیں ھیں که جو لوگ ھندستان میں پاکستان کا جھنڈا بلند کرتے تھے انھیں پاکستان (اگلے دو لفظ پڑھنے میں نھیں آتے). (ر.ش)

● ع ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا (ص۲۴۴)۔

امریکه تو ھے. (ر.ش)

● رئیس الاحرار (مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی) کے نیشنلسٹ خیالات کو مسلمانوں نے تو تسلیم نہ کیا، لیکن ان کی حب الوطنی کی قدر ہندوؤں اور سکھوں نے کی۔...... سکھوں اور ہندوؤں میں اس خاندان کی جو عزت تھی اس کی وجہ سے مسلمانوں کی اور مساجد کی آبادکاری کے کام میں بہت معاونت ہوئی۔ اور آج بھی ان کے خاندان کا ایک حصہ لدھیانے کے آبائی گھر مین مقیم ہے۔ (ص۲۴۷)

● جوش نے اپنے تجربہ کی بنیاد پر جھنجھلا کر کہا تھا ؎

یوں کراچی میں ہوں جس طرح سے کوفے میں حسین سب شہادت کے ہیں آثار، چنا جور گرم

(ریاض صاحب نے ان تین چار سطروں میں جو کتابت کی غلطیاں ھیں وہ بھی درست کرتے چلے ھیں)

● اہل پنجاب اور سندھ نے تقسیم کے وقت ہندستان سے آنے والے پناہ گزینوں کو دل اور گھروں میں جگہ دی تھی لیکن آہستہ آہستہ زبان و تہذیب کی خلیج بڑھ رہی تھی...... زبان، تہذیب، رنگ اور نسل کے اثرات بھی قوموں کی زندگی میں اتنے ہی اہم ہوتے ہیں کہ وہ اکثر مذہب کو نظرانداز کر کے کشت و خون کرا دیتے ہیں۔ صرف مذہب پر اتحاد کی بنیاد پر کوئی اتحاد پائیدار نہیں رہ سکتا۔ (ص۲۵۱)

● لیکن جوش جو کچھ ہندستان میں چھوڑ کر گئے تھے وہ انہیں پاکستان میں میسر آنا ممکن تھا۔ ان کا پاکستان سے

کوئی رشتہ نہ تھا۔ وہ ہندستان کی آزادی کی تحریک کے ہیرو، شاعرِاعظم اور پنڈت نہرو کے ذاتی دوست تھے۔ ان کا معاملہ ''خود کردہ را علاجے نیست'' کے زمرے میں تھا۔ (ص ۲۷۰)

● (ہندستان سے گئے ہوئے صابری صاحب سے عابداللہ غازی نے جو سوال کئے تھے ان کے جو جواب انھیں ملے اس میں یہ بھی تھا کہ) جب وہ لاہور میں کسی انٹرویو میں گئے تو آفیسر نے کہا: ''آپ ملازمت کی کوشش کراچی میں کریں، کچھ تو آپ لوگ مقامی لوگوں کے لئے چھوڑ دیں''۔ بلکہ یہ بھی کہا کہ ''ہندستانی مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن سمجھ کر وہاں اپنا مقام بنائیں۔ آپ کو قائداعظم کے حکم پر عمل کرنا چاہیے تھا''۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ علامہ کا فلسفہ حقائق پر مبنی نہیں ہے، دراصل قوم مذہب سے نہیں بنتی، یہ زبان تہذیب اور جغرافیہ سے بنتی ہے۔ (ص ۲۷۱)

This is the point نہ اقبال نہ مودودی، بس آزاد۔ (ر۔ش)

● ہندستان سے پاکستان جانے والے زیادہ تر کراچی اور سندھ میں آباد ہوئے اور انہوں نے خود کو مہاجر کہلوانا پسند کیا۔ پاکستان نے ہندستان میں اور خصوصیت سے دہلی میں بہت بڑی تعداد ہندوؤں اور سکھوں کی لٹ پٹ کر آئی تھی، جنھیں شرنارتھی (پناہ گزیں) کہا جاتا تھا۔ ان شرنارتھیوں نے خود اس تعارف پر اعتراض کیا اور کہا ہم کسی کی شرن (پناہ) میں نہیں آئے بلکہ ہم اپنے وطن میں آئے ہیں۔ پھر انہوں نے کسی بھی امداد پر بھروسہ نہیں کیا اور بہت جلد اپنی محنت سے اپنا مستقبل تعمیر کرنا شروع کر دیا اور دیکھتے دیکھتے کر بھی لیا۔ (ص ۲۷۳)

● ہندستان سے مسلمان ہجرت کر کے پاکستان گئے تھے۔ اول اول ان کی بہت آؤ بھگت ہوئی تھی، پھر وہ جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس کے بعد رقابت میں بدل گیا، پھر دشمنی قائم ہوگئی (ص ۲۷۴)

ایسا نہیں ھوا۔ (ر۔ش)

● حقیقت تو یہ ہے کہ قائداعظم نے تبادلۂ آبادی کو کبھی نہیں سوچا تھا۔ اور قائداعظم کے کہنے پر بہت سے مسلم لیگ کے لیڈر ہندوؤں کو جا جا کر سمجھا رہے تھے کہ وہ اپنے گھر چھوڑ کر نہ جائیں، بہت سے لوگوں نے جاتے وقت اپنی چابیاں بھی مقامی لوگوں کے حوالے کر دی تھیں جسے امانت سمجھ کے قبول کیا گیا تھا۔ (ص ۲۷۷)۔

● جب ہم پاکستان پہونچے تو حال یہ تھا بہت جلد پاکستان تحریک کے محکمات متشابہات بن گئے۔ ......ہماری ہندستانی حب الوطنی نے ہمیں مشکوک کر دیا۔ اور بعض لوگوں نے غدار کے لقب سے بھی نواز دیا۔...... ہندو اور ہندستان سے نفرت بڑھ رہی تھی...... کرکٹ کا ہر میچ پانی پت کا میدان تھا...... سیٹو اور بغداد پیکٹ ذریعے امریکن اور برطانوی امداد نے جنگ کا ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ اس جنگ کا ہر شخص منتظر تھا...... مسلمانوں نے خود اپنی خوشی سے ہندستان کے حوالے کیا تھا...... وہ مستقبل کو یاد ماضی کی بنیاد پر تعمیر نہ کر سکے۔ (ص ۲۷۸)۔

● ......ان (تسنیمہ) کے چھ بھائی اور دو بہنیں بھی امریکہ پہونچ گئیں لیکن جس دوسرات کے لیے یہ کام کیا تھا

وہ حاصل نہ ہوسکا امریکہ کی مادیت نے ان کے خاندان کو اپنے دام فریب میں بہت آسانی سے گرفتار کرلیا۔ (ص ۲۷۹)

● پاکستان کے قیام کا مقصد برصغیر کے مسلمانوں کو ایک آزاد اسلامی معاشرے میں زندگی کے بہترین مواقع فراہم کرنا تھا۔ وہ ان لوگوں کو چھوڑ بھاگے تھے جن کے نعروں اور قربانیوں نے پاکستان بنایا تھا۔ (ص ۲۷۹)

وہ لوگ بے وقوف تھے اور بے وقوفی کی سزا بھگتتے رہے (ر۔ش)

● عبدالمعید خان صاحب خود ایک ادارہ تھے۔ وہ ڈیوٹی سوسائٹی کے معتمد بھی تھے۔ ڈیوٹی سوسائٹی کوئی متمول ادارہ نہ تھی اور اس کا یہ بھی تجربہ تھا کہ مسلمان قوم قرض حسنہ لینے میں چست اور واپس کرنے میں سست بلکہ نادہندہ ہے۔ (ص ۳۰۷)

اسی وجہ سے بعد میں ڈیوٹی سوسائٹی نے قرض حسنہ کے اسکالرشپ دیے۔ (ر۔ش)

● علی گڑھ کی تاریخ میں ایسا متفقہ بلا مقابلہ الیکشن صرف ایک بار ہوا تھا وہ خواجہ غلام السیدین جیسی شخصیت کا معاملہ تھا۔ (ص ۳۰۹)۔

عشرت علی خاں قیصر ۱۹۴۵ء میں بہ اتفاق رائے صدر منتخب ہوئے تھے۔ (ر۔ش)

● ۱۹۵۸ء میں رفیع احمد صاحب کا انتقال ہوا، وہ سچے مسلمان اور پکے قوم پرست تھے، وہ (قدوائی صاحب) مقبول علیگیرین تھے۔ (ص ۳۱۶)۔

حصول آزادی سے قبل علی گڑھ میں Universally ..... of the alma mater کہلاتے تھے (ر۔ش)

● امریکہ کے مسلمانوں کے پلیٹ فارم ہم پر ہمیشہ بند رہے۔ کیوں کہ یہاں مسلمان قیادت کا طرز بیان اور طرز تحریر اکثر کاٹنے والا رہتا ہے، جوڑنے والا نہیں۔ (ص ۳۱۸)۔

● یونین کے کچھ عہدے داروں اور کچھ دوستوں نے مجھ سے فرمایا کہ ''یہ سال پُرسکون گذرا ہے۔ آپ زیدی صاحب (وائس چانسلر) سے کہہ کر دو ہفتہ امتحان کی تاریخ بڑھوالیں''۔ مطالبہ تو سادہ لوحی کا تھا ہمیں اس میں اپنا بھی بھلا نظر آیا کیوں کہ اب ہم کو بھی امتحان کی تیاری کے لئے کچھ زیادہ ہی وقت درکار تھا۔ (ص ۳۲۰)۔

جب سال پُر امن گزرا تو امتحان کا التوا کیوں؟ (ر۔ش۔)

● حامد انصاری کی کرکٹ سے دلچسپی بھی اکیڈمک نوعیت کی تھی ہم نے انہیں نہ بالنگ کرتے دیکھا نہ بیٹنگ، ہمیشہ ایمپائری کرتے ہوئے پایا۔ (ص ۳۳۱)

پھر وہ دو برس مسلم یونیورسٹی کورٹ اور دس برس راجیہ سبھا میں امپائری کرتے رہے۔ (ر۔ش)

وحدت الوجود اور وحدت الشہود

رضی احمد چشتی (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج)

بدقسمتی سے وحدت الوجود اور وحدت الشہود عقیدے بن گئے ہیں اور اس کے قائل لوگ الگ الگ فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ وحدت الشہود کے ماننے والے اس انتہا کو پہنچ گئے کہ وحدت الوجود کے ماننے والوں کو زندیق کہہ بیٹھے۔ اور جو لوگ وحدت الوجود کے قائل ہیں وہ وحدت الشہود کے ماننے واالوں کو فاسق کہنے لگے۔ یہ ساری غلط فہمیاں ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کے عوامی معنی کی پیدا کردہ ہیں۔ یہ کہنا کہ سب اللہ ہیں قطعی درست نہیں اور یہ کہنا کہ سب اللہ کے ہیں کچھ ایسے سوالات پیدا کرتا ہے جن کا جواب وحدت الشہود پر عقیدہ رکھنے والوں کے پاس نہیں ہے۔ دراصل وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے اور نہ ہی یہ ایک دوسرے کے منافی ہیں۔

مشیت الٰہی میں انسان کی تخلیق ایک خاص مقصد کے تحت ہوئی ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں (۲:۳۰)۔ تو آدمؑ کی تخلیق ہوئی اور حق تعالیٰ نے خود آدم کو تمام علم سے نوازا، اور خلافت کے تخت پر بیٹھانے سے پہلے ہی فرشتوں سے سجدہ بھی کروادیا، اور اس طرح سے آدمؑ کی سرداری منجانب اللہ سب پر قائم ہوگئی۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ انسان خلافت کا مستحق تسبیح وتقدیس کی بناء پر نہیں ہوا بلکہ اسماء کلھا کے حامل ہونے کی وجہ سے ہوا۔ حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ ایک ولی اللہ بنانا چاہتا ہے بلکہ یہ فرمایا کہ وہ خلیفۃ اللہ بنانا چاہتا ہے۔ خلیفہ کے معنی یہ ہے کہ جو بادشاہ حقیقی کے تمام اختیارات کا استعمال، اس کا قائم مقام ہوکر، اس کی طرف سے کرے۔ وحدت الشہود وہ مقام ہے جہاں پر عشق باقی رہتا ہے اور اس وجہ سے جوش باقی رہتا ہے۔ وحدت الوجود وہ مقام ہے جہاں پر بندہ پن ختم ہوجاتا ہے۔ یہ وصل کا مقام ہے جو سکون پیدا کرتا ہے۔ کاروبار جہاں چلانے کے لئے جوش کا قائم رہنا ضروری ہے۔ وحدت الوجود کا سالک پھنساوے سے باہر نکلنا چاہتا ہے، اسکو ہمہ وقت سکون کی طلب ہوتی ہے۔ وحدت الشہود کا سالک پھنساوے کو بطور چیلیج لیتا ہے اور اپنے لہو کو ہمیشہ گرم رکھتا ہے۔ حق تعالیٰ نے انسان کو کوئی عارضی خلیفہ نہیں بنایا بلکہ خلیفہ بنانے کے بعد یہ بھی فرمایا کہ اس نے زمین اور آسمان کے بیچ کی تمام چیزوں کو انسان کی مٹھی میں دیدیا ہے (۴۵:۱۳)۔ اس طرح حق تعالیٰ نے انسان کو ماسٹر آف دیونیورس بنادیا۔ غور کریں کہ کاروبار جہاں کو چلانے کے لئے ایک ایسا شخص کس طرح مناسب ہوگا جو کلی

طور پر اپنے کو جستجوئے حق میں جذب کر چکا ہے، جس کو ہر شئے میں اللہ نظر آئے وہ حکومت کیسے کرے گا، اس کو تو قاتل اور مقتول میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آئے گا۔

ہے عشق باقی تو جوشِ جنوں سلامت ہے
سکونِ دل کو جو مل جائے تو وصال ہے یہ

قرآن میں حق تعالیٰ نے دونوں ہی مقامات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حق تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم عنقریب اپنی نشانیاں آفاق میں دکھائیں گے اور پھر تمہاری ذات میں دکھائیں گے، یہاں تک کہ تمہیں یقین ہو جائے کہ یہی حق ہے (۴۱:۵۳)۔ آیت مذکورہ سے واضح ہے کہ انسان کا اولین فرض کائنات میں تصرف کرنا ہے اور اگر کسی وجہ سے ناکام ہو جائے تو مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیونکہ ایک عالم اس کی ذات میں بھی موجود ہے جس میں غور و فکر کر کے وہ قربِ الٰہی سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔

وحدت الشہود اور وحدت الوجود کے مقامات کے اپنے اپنے مزے ہیں: ایک بادشاہت میں مگن ہے تو دوسرا قربِ الٰہی میں مگن ہے۔ بالآخر خلیفہ وحدت الوجود کے مقام پر آجاتا ہے اور اگر اس میں وسعت ہے تو بعدِ وصل وہ دوبارہ دنیا کی طرف لوٹ جاتا ہے اور باقی باللہ ہو کر نیابت کرتا ہے۔

نہ حقیقتیں ہیں الگ الگ، کوئی چھو گیا کوئی پی گیا
کوئی شئے کو دیکھتا رہ گیا، کوئی منتہا سے گزر گیا

تو یہ شور کیوں ہے مچا ہوا کہ وجود ہے کہ شہود ہے
یہ تو راستے کے مقام ہیں تو یہاں رہا کہ وہاں رہا

☆☆☆

"یاد رکھیے ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے واسطے جد و جہد کرنا داخلِ حب الوطنی ہے۔ مگر آپ کے لیے ایک فرضِ دینی اور داخلِ جہاد فی سبیل اللہ ہے! آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق و صداقت اور انسانی بند استبداد و غلامی کے توڑنے کے لیے کی جائے"۔ (الہلال ۱۸، دسمبر ۱۹۱۲ء)۔

(مقتبس از مقالہ مصنفہ ڈاکٹر سلطان احمد بعنوان سرسید اور مولانا ابوالکلام آزاد)

ماضی کے دریچوں سے

مولانا آزاد اور مولانا ملیح آبادی

احمد سعید ملیح آبادی

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی میں رفاقت کا رشتہ ۳۸ رسال (۱۹۲۰ء سے ۱۹۵۸ء) تک قائم رہا۔ مولانا آزاد نے ۲۲ رفروری ۱۹۵۸ء کو وفات پائی اور سال بھر بعد مولانا ملیح آبادی کا ۲۴ رجون ۱۹۵۹ء کو انتقال ہوگیا۔ دونوں میں محبت اور اخوت کی بنیاد باہمی اعتماد پر تھی، دونوں ہی شمع آزادی کے پروانے تھے او دونوں نے ہی اپنی زندگیاں وطن کی آزادی کے لیے وقف کر دی تھیں، اسی مقصد نے انہیں ایک دوسرے سے قریب اور وابستہ کیا۔ مولانا ملیح آبادی ندوۃ العلماء لکھنؤ کے طالب علم تھے۔ ۱۹۱۲ء میں علامہ شبلی کی دعوت پر عالم اسلام کے جید عالم دین اور مفکر سید محمد رشید رضا ندوہ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے لکھنؤ آئے۔ علامہ رشید رضا قاہرہ (مصر) میں دعوت وارشاد کے نام سے اپنا مدرسہ چلاتے تھے، جسے جامعہ ازہر پر فوقیت حاصل تھی۔ ندوۃ کے اجلاس میں علامہ کی عربی تقریر کا اردو ترجمہ مولانا آزاد نے برجستہ کیا۔ مولانا آزاد کا ''الہلال'' نکل رہا تھا، جسے طالب علم ملیح آبادی بھی پڑھتے تھے۔ ندوۃ اجلاس میں ملیح آبادی نے پہلی مرتبہ مولانا کو دیکھا، اس کی دلچسپ روداد ملیح آبادی نے ''ذکر آزاد'' میں بیان کی ہے:

''لڑکوں کی انجمن نے غریب طالب علموں کی مدد کے لئے چائے پانی کی دکان ایک تنبو میں کھولی تھی۔ اس دکان میں ایک ''بوائے'' میں بھی تھا۔ میں چائے کی دکان میں ڈیوٹی پر تھا۔ اتفاق سے مولانا میری ہی باری پر چائے پینے آگئے۔ میں نے ٹرے لاکر سامنے رکھ دی۔ انہوں نے اطمینان سے چائے پی اور سگریٹوں پر سگریٹ جلاتے رہے۔ ایک پیالی کی قیمت شاید ایک آنہ تھی مگر مولانا نے ایک روپیہ رکھ دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں دیہاتی اور اناڑی، ایسے معاملات سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ لپک کر مولانا کو روک لیا اور کہا ٹھہرئے باقی ریزگی لاتا ہوں۔ مگر وہ عجب انداز سے مسکرائے اور کچھ کہے بغیر چلے گئے۔

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہونے سے پہلے ملیح آبادی آگے تعلیم حاصل کرنے مصر چلے گئے اور علامہ رشید رضا کے مدرسہ میں داخل ہوگئے۔ مصر اور ترکی میں قیام کے دوران ملیح آبادی نے سیاسی سرگرمیاں بھی شروع کر دیں۔ مصر پر انگریزوں کا غلبہ تھا، ہندوستانی فوجی مصر آتے تھے ملیح آبادی ان کے بیچ ہینڈ بل بانٹتے تھے کہ

انگریزوں کے لئے اپنی جان کیوں قربان کرتے ہو، ملیح آبادی پولس کی نظر میں آگئے اور بہت پریشانیاں اٹھائیں۔ ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہونے پر ہندوستان واپس آئے اور حکومت کے حکم پر پولس کی نگرانی میں رہنے کے لیے ندوۃ میں دوبارہ داخل ہوئے اور حدیث کی تکمیل کی۔ مصر میں حدیث کی تعلیم نہیں تھی۔ ندوۃ میں پھر پڑھائی کے ساتھ ملیح آبادی نے سیاسی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ ۱۹۲۰ء میں خلافت تحریک میں مولانا محمد علی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ساتھ شریک ہوگئے۔ کلکتہ میں خلافت کانفرنس مولانا آزاد کی صدارت میں ہوئی۔ ملیح آبادی اور مولانا آزاد کی ملاقات کانفرنس میں ہوئی۔ مولانا نے ملیح آبادی کو اپنے گھر پر وقت دیا تو ایسا معلوم ہوا گویا عمر بھر کے ساتھی ہیں۔ مولانا نے تفصیل سے اپنی اسکیم بتائی کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے کیا کرنا چاہتے ہیں اور ملیح آبادی کو شریک ہونے کی دعوت دی، وہ کسی پس وپیش کے بغیر فوراً راضی ہو گئے۔ دونوں کے خیالات میں مکمل یکسانیت تھی۔ یوپی میں بیعت کی مہم جاری تھی اور مقبول ہو رہی تھی۔ مولانا آزاد کے خلیفۂ مجاز مولانا ملیح آبادی کی کوشش سے مجاہد آزادی شیخ الہند مولانا محمود حسن نے مولانا آزاد کو امام الہند تسلیم کرلیا اور اس کا اعلان ہو گیا۔ اس کے بعد مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے مولانا آزاد کو امام ماننے کا تحریری اعلان کر دیا۔ ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ امامت کے معاملے کی اہمیت دفعتاً مولانا کے ذہن میں کم ہوگئی۔ ادھر سے ہٹ گئے تو یہ تحریر جاری کر دی کہ سرکاری عربی مدارس کا بائکاٹ کر کے قومی مدرسے قائم کے جائیں۔ خلافت تحریک زور شور سے جاری تھی۔ علی برادران کے جوش خطابت نے طوفان اٹھا رکھا تھا۔ مولانا آزاد اپنی تقریروں میں فکر و فصاحت و بلاغت کے سحر سے لوگوں کو مسحور کر رہے تھے۔ سرکاری مدرسوں کے جواب میں مولانا نے کلکتے کی جامع مسجد (مسجد نا خدا۔ زکریا اسٹریٹ) میں مدرسہ اسلامیہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو ملیح آبادی کو لکھنؤ سے کلکتہ بلا لیا۔ رین لین میں کرائے کے چھوٹے سے بوسیدہ مکان میں مولانا اپنی فیملی کے ساتھ مقیم تھے۔ گھر میں بیگم آزاد کے علاوہ مرحوم بڑے بھائی غلام یٰسین کی بیوہ، بہنیں اور یتیم بھتیجا نورالدین تھے۔ نیچے کی منزل رہائش کے لائق نہیں تھی، مولانا نے اپنے رفیق کو اوپری منزل میں فیملی کے ساتھ ٹھہرانا چاہا۔ جسے ملیح آبادی نے منظور نہیں کیا اور نچلی منزل کے برآمدے میں ٹاٹ کا پارٹیشن لگا کر اپنے لئے کمرہ تیار کرلیا۔ مسجد ناخدا میں مدرسہ اسلامیہ قائم ہوا تو سرکاری مدرسہ عالیہ کے دو ڈھائی سو طلباء مولانا کی تقریریں سن کر نکل آئے اور مدرسہ شروع ہوگیا۔ مدرسہ اسلامیہ کا افتتاح مہاتما گاندھی نے ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو کیا۔ گاندھی جی اور مولانا آزاد نے مسجد میں تقریریں کیں۔ مدرسہ کے مہتمم (پرنسپل) مولانا ملیح آبادی اور صدر مدرس شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی مقرر ہوئے۔ اس تعلق سے مولانا مدنی جب بھی کلکتہ آتے تو ملیح آبادی سے ملاقات کے لئے تشریف لاتے۔ عمر بھر یہ وضع قائم رکھی۔

مدرسہ اسلامیہ چل رہا تھا۔ خلافت اور سوراج کی تحریکیں شباب پر تھیں اور ملک انقلاب کے لئے تیار نظر

آرہا تھا، ایسے ماحول میں مدرسہ کی خاموش تعلیمی زندگی سے مولانا ملیح آبادی اوب گئے اور مولانا آزاد پر زور دینا شروع کیا کہ اخبار نکالا جائے۔ روزانہ ممکن نہ ہو تو ہفتہ وار ہی۔ ۲۳ر ستمبر ۱۹۲۱ء ہفتہ وار ''پیغام'' کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ ایڈیٹر مولانا ملیح آبادی تھے۔ پیغام میں خلافت و سوراج تحریک کی حمایت کے ساتھ پرنس کے بائیکاٹ کے لئے آگ برسانے والے مضامین سے حکومت برطانیہ سخت پریشان ہوئی۔ آخر ایک مہینے بعد ہی مولانا ملیح آبادی کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا اور دو سال کی سزا سنا دی گئی۔ دو ہفتہ بعد مولانا آزاد گرفتار کر لئے گئے۔ مولانا کو ایک سال کی سزا ہوئی۔ مولانا کی یہ پہلی گرفتاری اور سزائے قید تھی، رانچی میں چار سال فقط نظر بندی تھی۔ علی پور سنٹرل جیل میں دونوں رفقاء آزاد اور ملیح آبادی یک جا ہو گئے۔ یہ یکجائی اس لحاظ سے بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوئی کہ ملیح آبادی کے اکسانے اور اصرار پر مولانا آزاد نے ''تذکرہ'' والی اپنی ادھوری داستان زندگی قلم بند کرنا شروع کر دی۔ افسوس یہ بھی مکمل نہ ہو سکی اور مولانا سال بھر سے پہلے ہی رہا ہو گئے۔ پھر بھی ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' تیار ہو گئی۔ اس میں بہت کچھ آ گیا۔ مولانا کی وفات کے بعد ملیح آبادی نے کتابی صورت میں شائع کر کے اس تاریخی کتاب کو محفوظ کر دیا۔ پیغام کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنے رفیق ملیح آبادی کی گرفتاری پر جو نوٹ مولانا نے پیغام میں شائع کیا وہ ان کے دلی جذبات کا ترجمان ہے۔

جیل کے اندر اور جیل کے باہر دونوں میں خوب چھنتی تھی جس کی بہت کچھ اور دلچسپ داستان ملیح آبادی کی کتاب ''ذکر آزاد'' میں ملتی ہے اور مولانا آزاد ملیح آبادی کو مولوی صاحب کہتے تھے اور ملیح آبادی مولانا آزاد کو مولانا۔ ملیح آبادی کی دعوت پر مولانا ملیح آباد بھی گئے تھے اور آم کے باغ میں پٹھانوں کے ایک مختصر سے جلسے کو خطاب بھی کیا تھا۔ واپسی سفر میں مولانا نے ملیح آبادی کے بزرگوں اور پرکھوں کے متعلق اپنی تاریخی معلومات کے بیان سے ملیح آبادی کو حیران کر دیا۔ جیل سے رہائی کے بعد مولانا ملیح آبادی نے مولانا آزاد کے دو اور پرچہ جاری اور ایڈیٹ کئے۔ روزنامہ ''پیام'' اور عربی رسالہ ''الجامعہ'' پیام زیادہ دنوں نہیں چل سکا۔ روزنامہ اخبار کے لئے جتنے اور جیسے اسٹاف کی ضرورت ہوتی ہے وہ مہیا نہیں تھے۔ عربی رسالہ الجامعہ کافی مدت تک چلتا رہا۔ اس کا حلقہ اشاعت عرب ملکوں میں تھا۔ ۱۹۲۷ء میں مولانا آزاد نے ہفتہ وار ''الہلال'' دوبارہ جاری کیا جو چند مہینے نکل کر بند ہو گیا۔ مولانا آزاد قومی کاموں میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے اور کانگریس کی سوراج تحریک کے لئے زیادہ تر سفر میں رہتے تھے۔ ''الہلال'' (ثانی) کی ادارت کا پورا بوجھ مولانا ملیح آبادی نے اٹھایا۔ مولانا آزاد کے بہت کم مضامین ''الہلال'' میں شائع ہوئے۔ ایڈیٹر میں نام مولانا آزاد کا تھا مگر زیادہ تر مضامین ملیح آبادی کے ہوتے تھے جو مضمون نگار کے نام کے بغیر چھپتے۔ یہی وجہ ہے کہ دو کتابیں ''انسانیت موت کے دروازے پر'' اور ''شہید اعظم'' مولانا آزاد کے نام سے لوگوں نے شائع کر دیں، جبکہ ''شہید کربلا'' کے نام سے مولانا ملیح آبادی کی کتاب شائع ہو چکی تھی۔

''الہلال'' ثانی کے بند ہونے کے بعد ملیح آبادی کے لئے کوئی کام باقی نہیں رہ گیا تھا۔ بیکاری سے تنگ آ کر مولانا سے اجازت طلب کی کہ اپنا اخبار نکالیں۔ مولانا سے اجازت ملنے پر ۱۹۲۹ء میں روزنامہ ''الھند'' جاری ہوا۔ برطانوی حکومت کی شدید مخالفت اور تحریک آزادی کے سبب حکومت نے بھاری رقم ضمانت طلب کر لی۔ اخبار کسی سرمایہ کے بغیر بے سروسامانی میں نکلا تھا، مجبوراً اسے بند کر کے ''ہند جدید'' نکالا گیا۔ وہ بھی ضمانت کی نذر ہوا تو ''روزانہ ہند'' نکلا اور ''ہفتہ وار ہند'' بھی ساتھ ساتھ جاری کیا۔ ۱۹۴۷ء میں ایسے حالات پیش آئے کہ ''روزانہ ہند'' ہاتھ سے نکل گیا تب ہفتہ وار ''اجالا'' نکلا اور آزادی کے بعد روزنامہ ''آزاد ہند'' جولائی ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا۔ اخبار ابھی نکلا ہی تھا کہ ایک جان لیوا افتاد پڑی۔ میں شدید بیمار ہو کر بستر سے لگ گیا اور حالت اتنی بگڑی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ والد سخت پریشانی میں پڑ گئے۔ میری تیمارداری اور نئے نئے اخبار کی ذمہ داری تین مہینے کی بیماری کے بعد بستر سے اٹھنا نصیب ہوا۔ پھر دو تین مہینے اور لگے صحت بحال ہونے میں۔ اسی دوران میں مولانا آزاد کلکتہ تشریف لائے اور اپنے قدیمی رفیق ملیح آبادی کو یاد کیا۔ راج بھون میں ملاقات کے لئے والد کے ساتھ میں بھی گیا۔ مولانا محبت اور تپاک سے ملے۔ پھر فرمایا ''مولوی صاحب! دہلی میں مجھے آپ کی سخت ضرورت ہے، والد نے سخت عذر کیا کہ اخبار ابھی نیا نیا نکلا ہے اور احمد سعید کو اخبار چلانے کا تجربہ بھی نہیں ہے۔ مولانا نے میری طرف مسکرا کے دیکھا اور کہا 'کیا تم اخبار نہیں سنبھال سکو گے؟ عرض کیا جیسا آپ کا حکم ہو، پوری محنت کروں گا۔ میری عمر اس وقت ۲۲-۲۳ سال تھی۔ میرے جواب سے مطمئن ہو کے مولانا نے فرمایا 'مولوی صاحب! بطخ کے بچے کو تیرنا نہیں سکھایا جاتا، پانی میں اترتے ہی تیرنے لگتا ہے' پھر مولانا نے ملیح آبادی کو دہلی بلانے کی وجہ مختصراً بتائی۔

مولانا آزاد اور ملیح آبادی ایک مرتبہ پھر ایک گھر میں ساتھ رہنے لگے۔ کلکتہ میں مولانا کے کرائے والے بوسیدہ گھروں میں ملیح آبادی نے برسوں قیام کیا، مگر دہلی میں وزیر کے سرکاری بنگلے کی آرائش طبیعت کو راس نہیں آئی تو مولانا سے گزارش کی علاحدہ کوئی ٹھکانا کر دیں۔ مولانا کو خیال ہوا کہ شائد کوئی تکلیف رہائش کی ہے، سبب دریافت کیا تو کہا، یہ سرکاری اور وزارتی ماحول طبیعت پر گراں ہے۔ بے چینی رہتی ہے، مولانا نے پہلے تو شیر شاہ میں بندوبست کیا جہاں ان کے پرسنل سکریٹری اجمل خاں رہتے تھے۔ یہاں بھی دل اچاٹ ہو گیا تو پرانی دہلی میں گلی قاسم جان میں گھر کا بندوبست کیا جہاں ملیح آبادی کئی سال رہے اور یہیں قیام کے دوران گلے میں کینسر کا مرض ہوا۔ علاج کے لئے ٹاٹا میموریل اسپتال گئے اور کئی مہینے بعد بمبئی سے دہلی واپس آئے۔ مگر روگ لگ گیا تھا، چند سال ٹھیک رہے اور فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا کی وفات کے صدمے سے بالکل ٹوٹ گئے تو کینسر کا مرض دوبارہ ابھرا۔ بیماری نے زور پکڑا تو پھر ٹاٹا میموریل اسپتال بمبئی لے جایا گیا۔ وہاں ریڈیم کے ذریعہ آپریشن ہوا مگر صحت مند نہیں ہو سکے اور ۲۴ رجون ۱۹۵۹ء کی صبح صادق داعی اجل کو لبیک کہا۔ بمبئی میں نماز جنازہ ہوئی اور میت کو ملیح آبادلا

کر عام قبرستان میں دفن کیا گیا۔ بیماری کے دنوں میں مولانا آزاد پر ''ذکر آزاد'' کے نام سے کتاب تیار کر لی تھی جو فروری ۱۹۶۰ء میں مولانا آزاد کی پہلی برسی پر شائع ہوئی۔ مولانا آزاد کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب ایک تاریخی اور دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔

بیگم آزاد کی وفات:

مولانا آزاد قلعہ احمد نگر میں اگست ۱۹۴۲ء میں قید تھے۔ ادھر کلکتے میں ۱۹۔اے بالی گنج سرکل روڈ میں بیگم آزاد شدید بیمار تھیں۔ مولانا نے پیرول پر رہا ہونے اور آخری وقت اپنی شریک حیات کے پاس ہونے سے انکار کر دیا۔ آخر وہ بری گھڑی آ پہنچی۔ آنکھیں بند ہونے سے پہلے جان کنی کے عالم میں مولانا ملیح آبادی کو بیگم نے یاد کیا۔ بیگم آزاد کے کلکتے کے مانک تلا علاقہ میں سروتی میمن قبرستان میں ہزاروں سوگواروں کے بیچ دفن کیا گیا اسی قبرستان میں مولانا کے والد مولانا خیرالدین اور والدہ کی بھی قبریں ایک حجرے میں ہیں، ہر سال یہاں عرس ہوتا ہے مولانا کے بڑے بھائی غلام یٰسین کی قبر بھی یہیں ہے۔ مولانا ۱۹۴۵ء میں رہا ہوئے۔ پچاس سال بعد ۲۰۰۲ء میں بیگم صاحبہ کی قبر پر ایک بڑا پتھر میں نے چار زبانوں (بنگلہ، انگریزی، ہندی اور اردو) میں نصب کروایا۔

مولانا آزاد اور مولانا ملیح آبادی میں اخوت محبت اور رفاقت کے اٹوٹ رشتے کی یہ داستان ہمارے خاندان کی قیمتی وراثت ہے۔ مولانا کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی، بھتیجے نورالدین دہلی سے کلکتہ چلے آئے۔ برائیٹ اسٹریٹ میں اکیلی جگہ رہتے تھے۔ باہر نہیں جاتے تھے، کسی سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ دروازے پر باہر سے تالا پڑا رہتا تھا۔ مولانا کے سسرالی رشتے دار اسی برائیٹ اسٹریٹ میں دوسری جگہ رہتے تھے اور نورالدین کی دیکھ بھال رکھتے تھے۔ نورالدین سے ملنے میں کبھی کبھی جاتا تھا۔ بہت خوش ہوتے تھے اور پرانے دنوں کی باتیں یاد کیا کرتے تھے۔ شدید علالت اور کمزوری کے سبب مولانا آزاد کا بھارت رتن ایوارڈ لینے نورالدین دہلی نہیں جا سکے۔ حالانکہ حکومت نے انہیں دہلی لانے کے لئے اسپیشل جہاز، ڈاکٹر اور نرس کی پیش کش کی مگر نورالدین کی حالت ایسی تھی کہ بستر سے اٹھ نہیں سکتے تھے۔ ایوارڈ حکومت نے کلکتے بھیج دیا اور چند ہی روز میں نورالدین دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مولانا آزاد کی بہنوں کی اولاد در اولاد کے تعلق سے مولانا خیرالدین اور مولانا آزاد کا اب فقط حوالہ باقی رہ گیا ہے۔

تبصرہ-۱

نام کتاب: مآثر رحیمی (خان خانان بیرم اور عبدالرحیم کی سوانح)
مصنف: عبدالباقی نہاوندی
مترجم: سید منصور علی سہروردی
نظرثانی: ڈاکٹر شریف حسین قاسمی
حواشی وضمیمہ جات: ڈاکٹر حسن بیگ
صفحات: ۳۳۹
سال اشاعت: ۲۰۱۷ء
ناشر: دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔
مبصر: ب ع ر

حسن بیگ صاحب کی خان خاناں کے لئے فراواں محبت اور شریف حسین قاسمی صاحب کی عہد خان خاناں پر اتنی ہی فراواں نظر نے اس تالیف کو بہت قابل قدر بنا دیا ہے۔ شریف صاحب کی تمہیدی سطور سے ہم اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں:

''عبدالباقی نہاوندی کی معروف کتاب مآثر رحیمی کی دوسری جلد کا سلیس ورواں اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، جو مرحوم سید منصور علی سہروردی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یہ ترجمہ جناب ڈاکٹر حسن بیگ کی سرپرستی اور بیرم خاں خان خاناں اور ان کے لڑکے عبدالرحیم خان خاناں سے ان کی تاریخی اور ادبی دوستی کا ثمرہ ہے''۔

●

بہت دن کے بعد ایک مؤرخ کے قلم سے بڑی دلنشیں نثر پڑھنے کو ملی، اس سے ضرور لطف اٹھایئے، پھر آگے پڑھتے ہیں:

''مغل دور حکومت میں فن تاریخ نویسی کو بہت ترقی حاصل ہوئی۔ اس باب میں اکبر کے عہد کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ جتنے مختلف نقطہ ہائے نظر سے اس عہد کے تاریخی منظر نامہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور جتنے متنوع زاویوں سے اس کا مطالعہ کیا گیا ہے اس کی کسی اور عہد میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ایک طرف ابوالفضل، نظام الدین احمد اور ملا عبدالقادر بدایونی جیسے اساطین فن نے اس عہد کی تاریخ کو اپنے مخصوص انداز میں دیکھا، سمجھا اور اس کا مطالعہ وتجزیہ کیا اور اسے اپنے اسلوب بیان میں قلم بند کیا۔ دوسری طرف گلبدن بیگم، بابر کی بیٹی، ہمایوں کی بہن اور اکبر کی پھوپھی، بایزید بیات، ایک عام سرکاری افسر، اور جوہر آفتابچی، ایک شاہی خادم، نے اس فن کو یکسر نئی جہات سے روشناس کیا۔ انہوں نے اس عہد کی

تاریخ کو ان طبقات کے نقطہ نظر سے دیکھنے اور اس کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کرنے کا فریضہ انجام دیا جن کو ان مسائل سے نہ تو کبھی اس سے پہلے سروکار تھا اور نہ اس کے بعد۔ اس دور میں تاریخ نویسی کے میدان میں اس غیر معمولی اور بے نظیر تنوع کا ایک اور مظہر عبدالباقی نہاوندی کی گراں مایہ تصنیف 'مآثر رحیمی' بھی ہے۔ اس کا مقصد دربار شاہی سے ہٹ کر طبقہ امراء کی ایک نمائندہ شخصیت، عبدالرحیم خان خاناں کے کارناموں اور اس کے خاندان کی تاریخ کا مطالعہ ہے۔

طبقہ امراء کو مغل نظام حکومت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل تھی اور یہی طبقہ مغل حکمرانوں کی طاقت اور وقت کا سرچشمہ تھا۔ مغل نظام حکومت مین اس طبقہ کی اساسی اہمیت کی وجہ سے امراء کے خاندانی پس منظر، ان کے حالات اوران کی خدمات کو محفوظ رکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس موضوع پر کئی اہم کتابیں لکھی گئیں .... یہ امتیاز اس عہد میں صرف عبدالرحیم خان خاناں کو حاصل ہے کہ ان کی شخصیت کو ایک مستقل کتاب کو موضوع بنایا گیا''۔

●

مآثر رحیمی یعنی عبدالرحیم خان خاناں (م ۱۰۳۶ھ) کی سوانح عمری ہے۔ خان خاناں کا خطاب بیشک بیرم خاں کو پہلی بار دیا گیا، لیکن اس لفظ کی پہچان اور اس کا اعتبار عبدالرحیم ہی سے قائم ہوا، جو نظام الدین اولیاء کے مزار سے میل بھر کے اندر واقع اپنی شناخت قائم کیے رہا، اور وقت بدلا تو اس کی شان میں اور بھی اضافہ ہو گیا کہ آغا خاں فاؤنڈیشن اور اس کے مقامی کارکنوں نے اسے یاد رکھا۔ اللہ مغفرت کرے شیخ سلیم احمد کی جنھوں نے بڑے چاؤ سے اس عظیم مغل کو یاد رکھا تھا جس کی عظمتیں اکبر و جہانگیر کی وجہ سے چمک اٹھیں، مگر سچ یہ ہے کہ رحیم کا نام اکبر و جہانگیر ہی جیسا عظیم لگتا ہے، جس کا دلوں کی سلطنت پر اتنا ہی بڑا راج ہے، جیسا اکبر و جہانگیر کی دنیوی حکومتوں کا تھا۔ فرق ''ہے'' اور ''تھا'' کا رہ جاتا ہے!

ایران کی نہاوندی پہاڑیوں کے مضافات سے اُپجا، عبدالباقی نہاوندی، ہمدان کے تاریخی شہر سے نکل کے ۱۰۲۳ھ میں دابل کی بندرگاہ کے راستے خان خاناں کے برہان پور میں پہنچ کر، پھر ان کی وفات (۱۰۳۶ھ) تک اسی سے وابستہ رہا۔ نہاوندی نے ۱۰۲۶ھ میں اپنی ترتیب کو مکمل کر لیا تھا، اس کے آگے ۱۰۳۶ھ تک کے حالات نہیں لکھے جو مرتب نے پورے کیے ہیں، ص ۱۸۴ تا ۱۹۶۔ اس کے لئے قارئین پر مرتب کی شکر گزاری واجب ہے۔

عبدالرحیم کے زوال کے بعد نہاوندی ۱۰۲۹ھ تک دکن و برار میں انتظامی عہدوں پر فائز رہا۔

پچھلی صدی کے اوائل کے مشہور فاضل ہدایت حسین نے مآثر رحیمی کو بڑی محنت سے مرتب کیا جسے ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کیا (۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۱ء)۔

ہدایت حسین ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے مخطوطات کی تلاش پر مامور تھے، سوسائٹی نے، ان دنوں، مآثر رحیمی کے علاوہ طبقات اکبری، تاریخ مبارک شاہی، قانون ہمایونی، تاریخ خوش نویساں وغیرہ بھی شائع کیں۔ ان کے فاضلانہ کاموں پر ہدایت حسین کو شمس العلماء اور خان بہادر کے خطابات بھی ملے۔

مقام مسرت ہے کہ یہ قدیم طباعت جو اب مخطوطہ کا درجہ حاصل کر چکی تھی، اسے چند قدیم لائبریریوں میں تو دیکھا جا سکتا ہے، لیکن عام طور سے اب دستیاب نہیں ہے۔ حسن بیگ صاحب اور ان کے ہمکار شریف حسین قاسمی صاحب نے نہاوندی کے کارنامے کو مرحوم سید منصور علی سہروردی کے ترجمہ کی شکل میں اردو دنیا کو ایک اچھا تحفہ دیا ہے۔ کتاب کے متن کے ساتھ ساتھ اس حسن بیگ صاحب اور شریف حسین قاسمی کے فاضلانہ حواشی نے اس کتاب کو اور بھی قیمتی بنا دیا ہے۔

آغاز کتاب میں چند قابل قدر صفحات: اشتیاق احمد ظلی صاحب کا ''پیش لفظ'' شریف حسین قاسمی صاحب کا ''عرض حال'' حسن بیگ صاحب کا سخن ہائے گفتنی ۔اور۔ شریف حسین قاسمی صاحب و حسن بیگ صاحب کے بارے میں تعارفاً چند سطور۔ یہ تمہیدات ہوئیں اس کے بعد مآثر کے ترجمے کا متن شروع ہوتا ہے، جس کے مشتملات کی فہرست اس طور پر ہے : علی شکر بیگ۔ پیر علی بیگ۔ بیرک بیگ (یار علی بلال) و اسد بیگ۔ سیف علی بیگ۔ محمد بیرم بیگ۔ سفر عراق (ایران)۔ فتح قندھار۔ فتح کابل۔ فتح ہندستان۔ ہمایوں کا حادثاتی انتقال۔ تخت نشینی اکبر۔ جنگ گوناچور۔ شہادت خان خاناں (بیرم)۔ اوصاف خان خانان۔ عبدالرحیم بیگ۔ گجرات کی دوبارہ فتح۔ خطاب خان خانان۔ واقعات بابر۔ فتح سندھ۔ آغاز فتح دکن۔ تسخیر خاندیش۔ جنگ احمد نگر۔ جنگ اشتی۔ احمد نگر کی فتح۔ راجو دکنی اور ملک عنبر۔ اکبر کا وصال۔ نورالدین محمد جہانگیر۔ بقیہ حالات۔ خان خاناں کے مصائب۔ ملک عنبر کی عہد شکنی۔ اوصاف عبدالرحیم۔ آثار عبدالرحیم۔ شاہ نواز خاں۔ داراب خان۔ مرزا رحمان داد۔ بقیہ فرزندان۔ بیٹیاں۔ میاں فہیم۔

ضمیمہ جات: ترک قبائل۔ جہاں شاہ۔ پاٹن اور سہسترلنگ تالاب۔ عبدالرحیم کے روابط۔ عبدالرحیم اور ہندی شاعری۔ عبدالرحیم کا کتب خانہ اور کارخانۂ کتب۔ چاند سلطانہ۔ ابراہیم عادل شاہ۔ ملک عنبر۔ برہان پور۔

نئے مرتب نے آخر میں عبدالباقی نہاوندی، شمس العلماء ہدایت حسین اور سید منصور علی سہروردی، رحیم کے تینوں الگ الگ پرستاروں کا احوال دیا ہے۔ پھر ہندو تو ارحیم ۔اور۔ عبدالرحیم کی غزل اور اشعار کا اردو ترجمہ، یہ دو عنوانات قائم کر کے مزید 'مہم آزمائی' بھی کی ہے۔

تصاویر: بیرم خاں اکبر کو بندوق چلانا سکھاتے ہوئے۔ (۳) بیرم دربار اکبری میں (چشتر بیٹی)۔ (۵) بیرم خاں کا شعر جو وزیر خاں مسجد، لاہور میں باہر جانے والے دروازے پر لکھا ہے۔ (۶) بیرم خاں کا جمدھر جو خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں محفوظ ہے۔ (۷) سہسترلنگ تالاب جہاں بیرم خاں شہید ہوئے: کتبہ۔ (۸) مجسمہ بیرم خاں، عشق آباد، ترکستان میں۔ (۱۰) قلعہ سہون، سندھ، پاکستان۔ (۱۱) مقبرہ جانی بیگ ترخاں، ٹھٹھہ سندھ، پاکستان۔ (۱۲) جلال الدین اکبر اور نورالدین جہاں گیر۔ (۱۳) شاہزادہ دانیال ابن اکبر، صوبہ دار خاندیش۔ (۱۴) عبدالرحیم اپنی جوانی میں۔ داراب ابن عبدالرحیم، مان سنگھ، ملا شکر اللہ مصاحب عبدالرحیم، شاہ جہاں اور شہزادہ

پرویز بن جہاں گیر۔ (۱۵) جہاں گیر اور عبدالرحیم شہزادہ خرم کا خیرات کے لیے وزن کرتے ہوئے۔ (۱۶) عبدالرحیم عمر کے آخری حصے میں، اس تصویر کے چاروں طرف اشعار۔ (۱۷) عبدالرحیم کی تعمیر کردہ کاریز میں اترنے کی جگہ اور اس کے سامنے ایک کنواں برہان پور میں۔ اس طرح کے سو سے زائد کنوئیں آج بھی موجود ہیں، جو پانی کو تازہ رکھتے ہیں۔ (۱۸) برہان پور میں عبدالرحیم کا تعمیر کردہ حمام کا ایک حصہ۔ (۱۹) چاند بی بی (چاند سلطانہ)۔ (۲۱) ملک عنبر۔ (۲۲) مقبرہ شاہ نواز خاں بن عبدالرحیم برہان پور میں۔ (۲۳) مقبرہ عبدالرحیم، حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔

ان تصاویر میں عبدالرحیم خان خاناں کا مقبرہ جو نظام الدین اولیا کے مقبرہ سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے قابل ذکر اس لئے ہے کہ حال ہی میں آغا خاں فاؤنڈیشن نے جو تجدید عمارات قدیمہ کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس میں اس مقبرے کی طرف بھی توجہ کی ہے، زیادہ دلآویز ہوگیا ہے۔

ایسا ہی توجہ طلب ہے بیرم خاں کا اسٹیچو جو ترکمانستان کے عشق آباد میں: بیرم اور ترکمانستان دونوں کی عظمت کی یاد دلاتا رہتا ہے۔

کتابت/کمپوزنگ کی معمولی اغلاط (مثلاً خان خانہ = خان خاناں) سے قطع نظر ایک آدھ شعر بھی اگلے ایڈیشن میں ٹھیک کیا جاسکتا ہے، جیسے ایک شعر صفحہ ۱۹۶ پر ہے:

مرالطف جہانگیری زتائید ربانی　　دوبازہ زندگی داوہ دوبارہ خان خانی

مندرجہ شعر کو اس طرح پڑھا جائے:

مرالطف جہانگیری واز تائید ربانی　　دوبارہ زندگی دادہ دوبارہ خان خانانی

کتاب کے آخری صفحہ پر (ضمیمہ-۱۵) حسب دستور قدیم متعدد غلطیاں راہ پا گئی ہیں، ''جزائے قدر کہ دلم سخت آرزو منداست'' کو ''جزایں قدر'' پڑھا جائے۔ بناتیں ہیں کو بناتی ہیں پڑھا جائے۔

●

ضمیموں میں کئی کارآمد ضمیمے ہیں، خاص کر ترک قبائل (ص ۱۴) کے بارے میں صرف دو صفحوں کو محیط، ہندستان کے تعلق سے سارے ترک قبائل کے احوال پر مختصر ہوتے ہوئے بھی بڑے کام کی چیز ہے،

●

لیکن بعض ضمیمے مثلاً ضمیمہ-۱۴ جس کا عنوان ''ہندو تو ارحیم'' ہے، اگر نہ لکھا جاتا، بلکہ اس کتاب میں شامل نہ کیا جاتا تو اچھا تھا، یوں بھی اس کا اچھا خاصا حصہ غیر متعلق ہے، اور ضمیمہ نگار کا اصل ہدف جو رحیم کو ہندیانا تھا (جسے ضمیمہ نگار نے ہندوانا لکھا ہے) وہ دوسرے اہداف یا مباحث میں الجھ کر کچھ چند سطروں میں ہی سمٹ سکا ہے۔

بعض جگہ ہندستانی اکابر کے لئے غیر مہذب/نامناسب طرز ادا بھی روا رکھا گیا ہے، اس سے بچنا چاہیے۔

●

کتاب کے فاضل مرتبین نے مآخذ کی اچھی فہرست دی ہے جس میں اہم تر مندرجہ ذیل ہیں :

''عبدالرحیم خان خاناں اور ان کے دوہے (از حسن عزیز جاوید، کراچی ۱۹۶۸ء) شیخ سلیم احمد کی کتاب عبدالرحیم خان خاناں (دہلی ۱۹۹۰ء) چھوٹو بھائی نائک کی کتاب عبدالرحیم خان خاناں اینڈ ہز لٹریری سرکل (گجرات ۱۹۶۶ء) سید اظہر علی کی کتاب مرزا عبدالرحیم (کیمبرج کا تھیسس ۱۹۳۲ء) ونسی دھر کی کتاب عبدالرحیم اینڈ ہز ہندی پوئٹری (اسلامک کلچر ۱۹۵۰) نذیر احمد کی تحریر : عبدالرحیم کے کتب خانے کی قلمی کتابیں (معارف نومبر-دسمبر ۱۹۲۴)، یہ ایشیاٹک سوسائٹی والے نذیر احمد، اس زمانہ کے اہم محقق ہیں، جب علی گڑھ شعبہ فارسی کے نذیر احمد پیدا نہیں ہوئے تھے۔

چند باتیں اور:

● اگلے ایڈیشن میں رضا لائبریری نامی کتابچہ سے عبدالرحیم کی ایک تحریر بھی اس کتاب میں شامل کرلی جائے یا خود رضا لائبریری کے اصل نسخے سے تصویر لے لی جائے، تو کتاب کی تزئین میں کچھ اضافہ ہو جائے گا۔

● فارسی اشعار جہاں جہاں نقل ہوئے ہیں، انھیں دوبارہ پڑھ کر جہاں جہاں ضرورت ہو تصحیح کرلی جائے۔ مثلاً :

صفحہ 'ر' : بہ محفل شمع تاباں درگلستاں رنگ و بو باشی الٰہی ہر کجا باشی بہار آبرو باشی

شعر تو صحیح ہے مگر دوسرے مصرعہ کا مطلب ٹائپ ہونے سے رہ گیا ہے، جو اس طرح ہے :

دعا ہے کہ تو جہاں کہیں بھی ہو عزت و آبرو کی پوری بہار کے ساتھ رہے،

صفحہ ۲۱ : بساط حکومت بگستردہ بود ولی ہیچ فرصت ندادش حیات (غلط)
بساط حکوت بگستر دہ بود ولی ہیچ فرصت ندادش حیات (صحیح)
چنین طرفہ منصوبہ کس ندید زیکسوی شہ رخ زیکسوی مات (غلط)
چنیں طرفہ منصوبہ ای کس ندید (صحیح)

ص ۳۰: ہمایوں کے دو شعر : ای رحمت تو عذر پذیر ہمہ کس ظاہر بہ جناب تو ضمیر ہمہ کس
درگاہ درتو قبلہ گاہ ہمہ خلق لطف بکرشمہ دستگیر ہمہ کس

اس میں چوتھے مصرعہ کے ''لطف'' کو لطفی پڑھا جائے۔

ص ۶۹: بیرام بطواف کعبہ چوں بست احرام ....
.... گفتہ کہ شہید شد محمد بیرام

چوتھے مصرعہ میں بیرام قافیہ کی مجبوری ہے، لیکن پہلے مصرعہ میں، موزوں پڑھنے کے لئے الف کے بغیر ہی پڑھا جائے یعنی ''بیرم بطواف......''

ص ۸۵: محمد عربی کابروی ہر دو سراست کسی کہ خاک درنیست خاک برسراو

دوسرے مصرعہ میں 'در' کو 'درش' پڑھا جائے۔

ص۱۲۳: ایں متاعی است کہ دروں خانہ.........

اس مصرعہ میں 'دروں' کو صرف 'در' رہنے دیا جائے۔

ص۱۲۴: بغم عشق تو صد حیف زعمری کہ گذشت بیش ازیں کاش گرفتار غمت می بودم

دوسرے مصرعہ کے 'بیش' کو 'پیش' پڑھا جائے۔

ص۱۳۱: زعشق دور فتادم ملامتم برخاست مبادسر کہ بناشد بہ دردارزافی

'ارزافی' کو 'ارزانی' پڑھیں۔

ص۱۳۵: عذر بدتر زگناھش بگیر

'عذر' اور 'بدتر' کے درمیان 'اُ' بڑھا دیجیے۔

ص۱۹۳: عزیز مصر برغم برادران غیور قصر چاہ برآماد براوج ماہ رسید

دوسرے مصرعہ کے ابتدائی الفاظ یہ پڑھیں: ''زقعر چاہ.........''

ص۲۰۳: غواصی کن گرت گہری باید غواصی راچار ہنرمی باید

یوں پڑھا جائے: غواصی کن گرت گہری باید غواصی راچار ہنرمی باید

ص۲۰۳: بجرم عشق توام می کشند وغوغا نیست تونیر برسربام آ کہ خوش تماشا نیست

دوسرے مصرعہ کو اس طرح پڑھیں: ''نیز برسرعام آ کہ خوش تماشا ایست''

ص۲۰۴: ساغرے بررخ گلزارمی باید کشید ابر بسیار ست، مے باید کشید

دوسرے مصرعہ میں چند لفظ کمپوز ہونے سے رہ گئے۔

●

کمپوزنگ کی غلطیاں ہر تین صفحے میں ایک کی اوسط سے، اس لیے نظر انداز کر دینا چاہیے کہ اب پروف تو نہ مصنف پڑھتا ہے، نہ اس کے برابر کے سمجھدار ساتھی۔ وقت ہی نہیں (اور کام بھی تو الجھن کا ہے، بلکہ پتہ ماری کا)۔ تو یہ کام اب دوسرے یا تیسرے درجے کی سمجھ بوجھ والے کے سپرد کر دیا جاتا ہے: نتیجہ معلوم۔ اس سے درگزر کی بہترین راہ یہ ہے کہ خود اپنی سمجھ سے کام لے کر غلط کو صحیح کرتے جایئے اور کتاب اچھی ہے اس لئے سمجھ کے پڑھتے جایئے۔

●

چلتے چلتے ایک بات اور : خان بہادر ہدایت حسین صاحب پر ایک بہت اچھی تحریر ڈاکٹر منصور عالم کی، اس کتاب کے ضمیمے میں نقل ہوئی جو اس لائق ہے کہ اسے فکرِنو کے ماضی کے دریچوں سے ٹانک لیا جائے۔ وہ تو الگ کسی موقع پر نقل ہوگی فی الحال کہنا یہ ہے کہ اس کتاب میں اس منقول کے علاوہ اور بھی بہت سے کار آمد ضمیمے آگئے ہیں، جن کی فہرست اوپر نقل ہوئی۔ اتنی محنت کم تالیفات میں نظر آتی ہے۔

تبصرہ-۲

کتاب: جہاتِ سرسید

مصنف: ڈاکٹر شمس بدایونی

ضخامت: ۱۲۰　قیمت: ۲۵۰

اشاعت اول: ۲۰۱۸

ناشر: براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر شائستہ خان

شمس صاحب ۲۲/۲۳ کتابوں کے مؤلف/ مصنف/ مدوّن ہیں، ان کی مطبوعات مندرجہ ذیل ہیں:

دید و دریافت، شعری ضرب الامثال، از خاکِ بدایوں (تذکرہ و انتخاب)، حقائق و بصائر (مقالات)، مکاتیب شمیم (تدوین)، اردو نعت کا شرعی محاسبہ، شعری ضرب الامثال، شعرائے بدایوں، دربار رسول میں، اختر انصاری، دید پس دید، نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات، بجنوری بحیثیت ناقدِ غالب، شعرائے بدایوں دربارِ رسول میں، نقد و اثر، لطیف نامہ، غالب اور بدایوں، مکتوباتی ادب، مزارِ غالب، شبلی کی ادبی و فکری جہات، صحت زبان از جگر بریلوی، شبلی اور آزاد۔ مراسم و تعلق کا اولین دور، تفہیم غالب کے مدارج، حنیف نقوی کی ابتدائی تحریریں، خطوطِ شبلی مرتبہ امین زبیری۔

کتاب میں مندرجہ ذیل اہم ادبا کی تقریظات/ فلیپ/ تعارفات شامل اشاعت ہیں:

پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر یعقوب یاور، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر شائع قدوائی، پروفیسر فرمان فتحپوری، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر خلیق انجم۔

اس کتاب سے سرسید دو صدی تقریبات کے سلسلہ میں ایک اہم تحفہ کا اضافہ ہوا ہے، ساری تحریریں بڑے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ مشتملات میں (۱) سرسید کے خطابات (۲) سرسید کی مرتبہ کتاب فقرات یعنی صدر پندِ فارسی (۳) سرسید کے کمیاب مجموعہ ہائے خطوط (۴) مکاتیب سرسید کا قلمی نسخہ، اور (۵) تجاویز سرسید اور تاریخ رموزِ اوقاف،

شامل ہیں۔ مضامین کا یہ مجموعہ اس لائق ہے کہ سرسید دوصدی تقریبات پر پیش ہونے والی کتابوں میں اونچے مقام پر رکھا جائے۔

مندرجہ ذیل عکسی نوادر کی فہرست شامل اشاعت ہے:

سرورق تہذیب الاخلاق، اخبار سائنٹفک سوسائٹی، قواعدِ صرف ونحو زبانِ اردو، رسالہ صرف ونحو قواعدِ اردو، قواعدِ زبان انگریزی، کتاب فقرات، تحریر فی اصول التفسیر، سرسید کے خطوط، مکاتبات الخلان، خطوط سرسید۔ قلمی نسخے کے دیباچے کا عکس، تصویر سرسید، مقبرے کا کتبہ، میڈل کا عکس، فیض گیٹ کا عکس، جلاء القلوب بذکر المحبوب، آثار الصنادید، آئین اکبری، سیرت فریدیہ۔

ضیاالدین لاہوری بھی ان میں سے اکثر کے عکس اپنی کتابیاتِ سرسید میں دے چکے ہیں لیکن اس کتاب میں بھی ایک بار پھر متعلقہ عکس دیکھ کر اچھا لگا، آنکھوں کی روشنی بڑھی۔

رموزِ اوقاف کے سلسلہ میں سرسید کی تجاویز پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے رموز کی پوری تاریخ لکھ دی ہے اور سچ یہ ہے کہ اس موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: اردو نثر کو سائنسی میلان، عقلی رجحان اور مقصدی وافادی طرزِ بیان سے روشناس کرانے اور قدیم مسجع ومقفیٰ مبہم اسلوب کے مقابلے ایک نئے سادہ، عام فہم مگر شگفتہ اسلوب سے متعارف کرانے والوں میں سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) کا نام نامی سرفہرست ہے۔ سرسید کا مقصد محض علم وادب کی خدمت کرنا نہیں تھا بلکہ ان کا ہدف اس دور کا مسلم معاشرہ تھا، جس کی تہذیبی، تعلیمی، تمدنی، معاشرتی ومذہبی اصلاح وتربیت ان کا مطمح نظر تھا۔ انھوں نے اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے اصلاحی پروگرام کے مختلف شعبوں پر وقتاً فوقتاً اظہارِ خیال کیا، تجاویز پیش کیے، منصوبے بنائے اور علمی اقدام کیے''۔

سرسید کی یہ تصنیف پہلی بار **علامات قرأت** کے عنوان سے تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی اکتوبر ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی۔ اور اس کی از سرِ نو اشاعت ۱۹۶۰ء کے علی گڑھ ہی کے تماہی **فکر ونظر** کی جولائی ۱۹۶۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ یونیورسٹی لائبریری کے شعبہ مشرقیات کے نگراں مشتاق حسین صاحب مرحوم کی دریافت تھی، جسے انھوں نے ۱۹۶۴ء میں بصورت کتابچہ بھی شائع کر دیا، ناشر تھے آزاد کتاب گھر دہلی، ان مشتاق حسین صاحب کے بارے میں، مرتب کی طرف سے ایک کارآمد نوٹ اس طرح ہے:

''مشتاق حسین کے بارے میں علی گڑھ کے بعض احباب سے رابطہ قائم کرنے کے باوجود مجھے بہت زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوسکی۔ وہ تین کتابوں کے مرتب ہیں: (۱) مکاتیب سرسید احمد خاں (حصہ اول، دوم) سول لائن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۶۰ء، تعداد صفحات: ۴۰۰، (۲) علامات قرأت آزاد کتاب گھر دہلی، بار اول، ۱۹۶۲ء تعداد صفحات: ۲۴، (۳) باقیاتِ شبلی، آزاد کتاب گھر، دہلی بار اول ۱۹۶۴ء، تعداد صفحات ۲۲۴۔ باقیاتِ شبلی مجلس ترقی ادب لاہور، بار دوم،

۱۹۶۵ء، کتابوں پر ان کے نام کے ساتھ لکھا ہے: فاضلِ ادب (عربی) لکھنؤ یونیورسٹی، اسسٹنٹ لائبریرین (شعبۂ مشرقیات) مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ اپنی مرتبہ کتابوں پر لکھے دیباچوں سے وہ صاحب نظر ادیب معلوم ہوتے ہیں، غالباً ۱۹۶۹ء سے پیشتر کسی سال میں انھوں نے انتقال کیا"۔

مشتاق صاحب کو اب تو علی گڑھ میں کوئی نہیں جانتا، مگر ۱۹۶۰ء میں مکاتیب سرسید کی ترتیب پر خلیل الرحمٰن اعظمی نے مشتاق صاحب کے بارے میں جس پیار سے تفصیلی مقدمہ لکھا وہ اب بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ یا پھر اب شمس بدایونی نے انھیں جو خراج عقیدت پیش کیا ہے، وہ نقل کرنے کے لائق ہے۔ لکھتے ہیں: "اپنی مرتبہ کتابوں پر لکھے دیباچوں سے وہ صاحب نظر ادیب معلوم ہوتے ہیں"۔ اس زمانے کے ایک ہمصر جریدہ **علیگ** نے انھیں پروفیسر حبیب، پروفیسر ہادی حسن، پروفیسر عبدالعلیم جیسے اکابر کی صف میں گنا تھا؛ اور اس اعتراف کے ثبوت میں اس جریدہ میں چھپی ہوئی، اس عہد کی بڑی شخصیات کے بارے میں جو خاکے شائع ہوئے، ان میں مشتاق حسین بھی شامل ہیں، مشتاق صاحب کا خاکہ قابلِ دید ہے۔

بات مشتاق صاحب اور ان کی مرتبہ کتاب علامات قرأت مصنفہ سرسید کے ضمن میں بات لمبی ہوگئی، کہنا یہ تھا کہ اس کتاب میں سرسید کے سلسلہ میں تحقیق اور تنقید کے اچھے نمونے یکجا مل جاتے ہیں۔ خاص طور سے سرسید کے مکاتیب اور خطابات پر شمس صاحب نے جس گہرائی اور گیرائی سے گفتگو کی ہے، ان کی ان تحریروں کو آئندہ لکھنے والے، محقق بآسانی رشید حسن خاں ثانی مان لیں گے، بلکہ ان کی روایت کو اور آگے بڑھانے والے!

اہم تربات یہ کہ **مکاتیب سرسید کا قلمی نسخہ** مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ) میں محفوظ ہے، کتاب میں یہ خاص مضمون شمس صاحب کی سب سے اہم دریافت، نسرین بصیر کا مرتبہ "مکاتیب سرسید کا قلمی نسخہ" ہے، خطوط بھی اہم ہیں اور ان کی دریافت بھی۔

☆☆☆

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی کی نئی کتاب

مسائل ومباحث

پروفیسر شروانی کی نئی کتاب مسائل ومباحث حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں ۱۹۴۹ء سے ۲۰۱۷ء تک کے سیاسی مسائل ومباحث پر تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ جن میں مسلمانانِ ہند، ہندوستان اور بیرونِ ہند سے متعلق امور پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان میں تقریباً ۷۰ برس کے حالات وکوائف آجاتے ہیں۔

کتاب کی ضخامت ۳۴۷ صفحات ہے اور قیمت =/۵۰۰ روپے ہے۔

متعدد مشاہیر کی وفیات بھی شامل ہیں۔

ناشر

براؤن بکس پبلی کیشنز، نئی دہلی 110025

+91-9818897975,0571-2700088

ملنے کے پتے:

(۱) براؤن بکس، علی گڑھ

(۲) ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

(۳) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، علی گڑھ

Monthly **FIKR-E-NAU** Aligarh

May 2019

تصانیف پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی

۱- میر کارواں ابوالکلام آزاد ۴۰۰ روپے

۲- انڈیا ونس فریڈم - ایک مطالعہ ۴۰ روپے

۳- شذرات ریاض شروانی ۳۵۰ روپے

۴- کتابوں کے درمیاں ۵۰۰ روپے

۵- مقالات ریاض شروانی ۴۰۰ روپے

۶- انساں کیسے کیسے ۳۰۰ روپے

۷- دھوپ چھاؤں (زمانہ طالب علمی کے حالات) ۲۰۰ روپے

ملنے کا پتہ:

ایجوکیشنل بک ہاؤس

شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ